ریمنڈ ڈیوس کی کتاب کا اُردو ترجمہ

کرائے کا فوجی

پاکستانی جیل میں گزارے ایام اور سیاسی و سفارتی بحران کی کشمکش

THE CONTRACTOR

ابو حذیفہ

ریمنڈ ڈیوس

سٹروم ریبیک، ترجمہ: وسیم شیخ

Scanned with CamScanner

THE CONTRACTOR

ریمنڈ ڈیوس کی کتاب کا اردو ترجمہ

کرائے کا فوجی

پاکستانی جیل میں گزارے ایام اور سیاسی وسفارتی بحران کی کشمکش

ریمنڈ ڈیوس

سٹروم ریبیک ، ترجمہ: وسیم شیخ

ابو حذیفہ

فیکٹ پبلی کیشنز

B/14 علی پلازہ سیکنڈ فلور ٹیمپل روڈ لاہور فون: 042-36374538

Website: www.factpublications.com
Email: factpublications@fact.com

Scanned with CamScanner

جملہ حقوق محفوظ

THE CONTRACTOR

کتاب	:	دی کنٹریکٹر/کرائے کا فوجی
مصنف	:	ریمنڈ ڈیوس/سٹروم ربیک
ترجمہ	:	وسیم شیخ
ڈیزائن	:	فیکٹ کری ایٹو ڈیپارٹمنٹ
قانونی مشیر	:	تیموری لاء ایسوی ایٹس 13 فمن روڈ لاہور
قیمت	:	Rs:450/

Fact Publications aims to promote creative
work through book publishing
More details for our publications, Visit at:
www.factpublications.com
We welcome your feed back at:
editor@factpublications.com

بہترین کتاب کی اشاعت کیلئے رابطہ کریں:
042 36374538, 0345 4341445

Scanned with CamScanner

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
☆	اظہار مصنف	7
1	مزنگ چوک لاہور پاکستان (27 جنوری، پہلا دن)	9
2	بگ سٹون گیپ، ورجینیا	16
3	کابل، افغانستان	22
4	مزنگ چوک، لاہور، پاکستان (27 جنوری، پہلا دن)	27
5	مزنگ چوک، لاہور، پاکستان	29
6	پرانی انارکلی بازار، لاہور (پہلا دن)	34
7	پرانی انارکلی پولیس اسٹیشن، لاہور	41
8	امریکی سفارت خانہ، اسلام آباد	50
9	لاہور کنٹونمنٹ، لاہور	53
10	لاہور کنٹونمنٹ، لاہور (28 جنوری، دوسرا دن)	59
11	لاہور پولیس ٹریننگ کالج، لاہور (29 جنوری، تیسرا دن)	65
12	لاہور پولیس ٹریننگ کالج، لاہور، (یکم فروری، چھٹا دن)	71
13	لاہور پولیس ٹریننگ کالج، لاہور (6 فروری، 11واں دن)	75

Scanned with CamScanner

14	لاہور پولیس ٹریننگ کالج، لاہور (10 فروری، 15واں دن)	79
15	ماڈل ٹاؤن کچہری، لاہور (10 فرووری، 16واں دن)	84
16	قونصل جنرل ریذیڈنس، لاہور (15 فروری، 20واں دن)	91
17	کوٹ لکھپت جیل، لاہور (16 فروری، 21واں دن)	100
18	کوٹ لکھپت جیل، لاہور (17 فروری، 22واں دن)	102
19	کوٹ لکھپت جیل، لاہور (19 فروری، 24واں دن)	108
20	کوٹ لکھپت جیل، لاہور (20 فروری، 25واں دن)	113
21	ہائیلینڈ رانچ، کلوروڈو (20 فروری، 25واں دن)	120
22	کوٹ لکھپت جیل، لاہور (20 فروری، 25واں دن)	122
23	مسقط، عمان (23 فروری، 28واں دن)	124
24	کوٹ لکھپت جیل، لاہور (3 مارچ، 36واں دن)	129
25	کوٹ لکھپت جیل، لاہور (14 مارچ، 47واں دن)	134
26	کوٹ لکھپت جیل، لاہور (16 مارچ، 40واں دن)	136
27	کوٹ لکھپت جیل، لاہور (16 مارچ، 49واں دن)	140
28	کوٹ لکھپت جیل، لاہور (16 مارچ، 49واں دن)	146
29	کابل ایئر سپیس (16 مارچ، 49واں دن)	152
30	اختتامیہ	156

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

اپنے بیٹے کے نام

اس امید کے ساتھ کہ وہ محفوظ دنیا میں بڑا ہو۔

Scanned with CamScanner

ابو حذیفہ

اظہار مصنف

جو وقت میں نے ایک پاکستانی جیل میں بسر کیا، اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بدقسمتی سے وہ زیادہ تر جھوٹ ہے۔ میں یہ کتاب تحریر کرتے ہوئے ریکارڈ درست کرنے کی امید کرتا ہوں اور بہت سی باتیں سامنے لانا چاہتا ہوں۔ اگر میں کوئی معلومات چھپا رہا ہوں تو اس کی وجہ اپنی قومی سلامتی اور امریکی سکیورٹی سروسز کے اہل کاروں اور کنٹریکٹرز یعنی خفیہ سروسز سے جڑے لوگوں کا تحفظ مقصود ہے۔ ان میں سے کچھ لوگوں کے نام بدل دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب نہ تو اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے خیالات کا اظہار کرتی ہے اور نہ ہی کسی خفیہ فوجی کنٹریکٹنگ کمپنی کے خیالات کا، جس کا میں ملازم ہوں۔ کتاب میں بیان کردہ زیادہ تر واقعات میری یادداشت پر مبنی ہیں اور صرف چند قابل ذکر استثناء کے ساتھ میں نے تمام واقعات بیان کر دیئے ہیں۔ میں نے اُس وقت کی سب سے زیادہ اہم بات چیت کو یاد کرنے کے لئے اپنی پوری کوشش کی ہے اور میں غیر جانبدار ہو کر سب چیزوں کو سامنے لے آیا ہوں۔ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ میں اہم واقعات بیان کرتے ہوئے اپنی بہترین یادداشت کو بروئے کار لاؤں۔

ریمنڈ ڈیوس

Scanned with CamScanner

1

ابو حذیفہ

مزنگ چوک لاہور پاکستان

(27 جنوری، پہلا دن)

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ کچھ معمولی اور دلچسپ فیصلے مل کر بہت بڑے نتائج کے حامل ثابت ہوتے ہیں۔ میں کم و بیش ایک گھنٹے سے جاگ رہا تھا جب ایسی ہی ایک چوائس میرے سامنے تھی۔ میرے ٹیم لیڈر، جو ایک سابق نیوی سیلر تھا، نے مجھے اطلاع دی ،"باہر ایک ہی گاڑی SUV ہے۔کیا آپ کو اس کی ضرورت ہے؟ اگر نہیں تو کیا میں اسے آفس لے جاؤں؟"

ہمارا دفتر لاہور میں امریکی قونصلیٹ جنرل تھا۔ ہمارا کام نجی فوجی ٹھیکیداروں کے طور پر غیر ملکی ماحول میں کام کرنے والے امریکیوں کی حفاظت کرنا تھا، خاص طور پر جو دشمنوں کے ماحول میں رہتے ہیں۔ یقیناً یہ بہت خوشگوار کام نہ تھا۔ کچھ لوگ ہمیں پر کشش سکیورٹی گارڈ سمجھتے تھے، جبکہ کچھ اور ہمیں خنجر بردار دستے قرار دیتے تھے جن کا کام ہلاک کرنا تھا ۔بہر حال ہمارا جو بھی کام تھا، بہت اہمیت کا حامل تھا۔ اگر ہم نہ ہوتے تو بیرونی ممالک میں کام کرنے والے بہت سے مزید امریکی ہلاک ہو چکے ہوتے۔

میری پسند کی گاڑی ایک SUV تھی۔ ایک مرتبہ افغانستان میں کسی مشن پر ایک بڑی SUV لے گیا جس کا فریم ٹوٹ گیا۔ ہم بہت مشکل سے اُسے واپس لائے۔ ہمارے

Scanned with CamScanner

پاس یہاں لاہور میں ایک چھوٹے سائز کی SUV تھی۔ سٹیل باڈی کی وجہ سے یہ آرمرڈ گاڑی ہمارے اعتبار کی تھی۔ ٹیم ورک کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ وہ SUV لے جائے، میں سفید سیڈان لے جاؤں گا۔ میرا ارادہ لاہور کی گلیوں میں کار چلانے کا تھا۔ اس کے بعد واقعات کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو جان ایف کینڈی سکول اور ہاورڈ یونیورسٹی میں ایک سٹڈی کیس کے طور پر دیکھا گیا کہ کس طرح چھوٹے چھوٹے واقعات مل کر ایک خوفناک بحران کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ یہ واقعہ لاہور میں پیش آیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرے نام کے ساتھ جڑ گیا۔ ایک چھوٹی سی غلطی اور ایک اہم سنگین سفارت بحران آپ کے درپے، اور پھر آپ تمام عمر اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے ہیں۔ اگر میں اُس صبح قدرے جلدی بیدار ہو جاتا تو شاید یہ واقعات پیش ہی نہ آتے۔

میں اس واقعہ سے کوئی ہفتہ بھر پہلے ہی لاہور آیا تھا۔ یہ گزشتہ دو سال کے دوران میرا پاکستان کا نواں دورہ تھا۔ میں نے اپنا نصف وقت افغان سرحد کے قریبی شہر، پشاور جبکہ نصف لاہور میں بسر کیا تھا۔ ایک کروڑ سے زائد آبادی کا یہ شہر صوبہ پنجاب کا دارالحکومت ہے اور لاتعداد مساجد، تعلیمی اداروں اور مارکیٹوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ شہر میں سیر کے دوران ہم نے خیال رکھنا تھا کہ کسی ناخوشگوار واقعے کا سامنا نہ ہو۔ پلیز مجھے غلط نہ سمجھیں، بطور سکیورٹی کنٹریکٹر ہم نے بہت سے اہم افراد کی حفاظت کو یقینی بنانا تھا۔ غیر ملکی علاقہ ہونے کے باوجود میرا کام عام طور پر غیر معمولی تھا اور یہ وہی راستہ تھا جسے میں نے پسند کیا۔ ہم ایک عظیم کام کر رہے ہیں۔

اُس وقت پاکستان امریکہ مخالف جذبات سے کھول رہا تھا، چنانچہ ہمارا کام مزید دشوار ہو چکا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے میں یو ایس ایڈ کے افسران کی حفاظت پر معمور تھا جو افغانستان کے دیہی علاقوں میں چھوٹے مکانات اور سڑکیں تعمیر کرنے کا پروگرام رکھتے تھے

Scanned with CamScanner

ہم مقامات کا جائزہ لینے کے لیے روانہ ہوئے، لیکن میں نے ہر کسی کو خبردار کیا کہ یہ ملک بارودی سرنگوں سے بھرا ہوا ہے، چنانچہ وہ محتاط رہیں۔ تاہم گروپ میں شامل ایک خاتون کوئی تصویر لے رہی تھی کہ میں نے اُسے چلا کر خبردار کیا کہ وہ کوئی اور قدم نہ اٹھائے کیوں کہ وہ بارودی سرنگوں کے درمیان کھڑی ہے۔ پھر میں نے اُس پارٹی کو بہت مشکل سے اُس خطرناک علاقے سے نکالا۔ سکیورٹی کنٹریکٹرز کا سب سے مشکل کام ایسی ناگہانی صورت حال سے بچنا اور اہم افراد کو بچانا ہوتا ہے۔ کبھی آپ دوستوں کے ساتھ بیئر پی رہے ہوتے ہیں، کبھی آپ کی لاش بیگ میں بند ہو کر واپس وطن جا رہی ہوتی ہے۔

افغانستان اور پاکستان، دونوں کا ماحول یکساں طور پر خطرناک ہے۔ تاہم اس ناگہانی پن کا ممکنہ تدارک کرنے والی چیز آپ کی مہارت ہے کیونکہ آپ عام افراد نہیں ہیں۔ آپ نے ایسے ہی مواقع سے نمٹنے کی اعلیٰ ترین مہارت حاصل کی ہوتی ہے۔ بہت سے جنگی ماہرین ریٹائرمنٹ کے بعد طویل عرصے تک بہت کامیابی سے سکیورٹی کنٹریکٹرز کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ طویل تجربہ اُنہیں بہتر اور فوری فیصلے کرنے اور جان بچانے کے قابل بنا دیتا ہے۔ لیکن اس کام میں ایک اہم عامل قسمت بھی ہے۔ جس دن قسمت آپ سے روٹھ گئی، مہارت اور حربی صلاحیت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ ایک بات آپ نہیں جانتے کہ قسمت آپ کو کتنے مواقع دینا چاہتی ہے۔ چونکہ خطرہ مستقل ہے، اس لیے یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ پریشان ہوتے رہیں، یا اسے ایک معمول کے طور پر لیں۔

اب واپس لاہور میں پیش آنے والے واقعات کا ذکر کرتا ہوں۔ جب میں نے اُس سفید سیڈان کا اسٹیئرنگ سنبھالا اور سکاچ کارنر کے اُس احاطے سے باہر آیا جہاں میری ٹیم ٹھہری ہوئی تھی تو میرے ذہن میں خود کو درپیش کام کے سوا کچھ نہ تھا۔ باہر جانے کا مقصد اُس راستے کا جائزہ لینا تھا جس پر مجھے تین دن بعد سفر کرنا تھا۔ میں اُس راستے پر ممکنہ

Scanned with CamScanner

خطرناک مقامات کی نشاندہی کرنا چاہتا تھا۔ میری نظریں کسی خطرناک مقام کی نشاندہی کے لیے اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ پاکستان جیسے ملک میں آپ کو ہمیشہ ہی چوکنا رہنا پڑتا ہے۔ دہشت گردی کی جنگ کے آغاز کے بعد سے پاکستان میں امریکہ کے سفارتی مشن پر درجنوں حملے ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ امریکی بزنس مقامات بھی حملوں کا نشانہ بن چکے تھے۔ 2010ء میں دہشت گردی کی کارروائیوں میں ہلاک ہونے والے پاکستانیوں کی تعداد افغانوں سے کم نہ تھی، حالانکہ یہ جنگ پاکستان میں نہیں، افغانستان میں لڑی جا رہی تھی۔ کم از کم سرکاری طور پر یہی کہا جاتا تھا۔

باوجود اس کے کہ لاہور بہت بڑا شہر ہے، یہاں کبھی اُس طرح کا خطرہ محسوس نہیں کیا گیا جتنا کراچی میں، جہاں دہشت گردی کے حملے ایک معمول تھے۔ یقیناً لاہور بغداد نہ تھا، لیکن پھر یہ کنساس بھی نہ تھا۔ میں حسب عادت چوکنا لیکن ماحول کا لطف لے رہا تھا۔ میں ایک گانے کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔ مجھے ایک لڑکی کی یاد بھی آئی، لیکن یہ یاد بہت مختصر ثابت ہوئی۔

میں مال سے ایک ذیلی سڑک پر آیا جو ایک کھلی گلی تھی اور جس میں برطانوی دور کی خوبصورت عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ یہ اس دور کی یادگاریں تھیں جب پاکستان برطانوی راج کا حصہ تھا۔ میں گاڑی چلاتے ہوئے بہت محتاط نظروں سے گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا اور اس علاقے کی مسلسل کسی بھی مشکوک سرگرمی کے لئے مسلسل سکیننگ کر رہا تھا۔ ایک نوجوان کی کمر کے قریب ابھار کا مطلب ہے کہ وہ بندوق لے کر لے جا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ایک بھاری بھر کم گاڑی بارود سے بھری ہو سکتی ہے۔ کھلے لباس والی کسی عورت نے خودکش جیکٹ پہنی ہو سکتی ہے۔ یہ سب خطرات اپنی جگہ پر موجود تھے۔ میں نے گذشتہ پانچ روز ایسے ہی خطرات کا جائزہ لینے میں بسر کیے تھے۔ لاہور میں سفر کرتے ہوئے ٹریفک جیم کا

Scanned with CamScanner

بھی خیال رکھنا ہوتا تھا۔ درحقیقت یہاں سفارتی نمبر پلیٹ رکھنے والی گاڑیوں کو روک کر بدسلوکی کے واقعات بھی تواتر سے پیش آ رہے تھے۔ جب پولیس ہماری کسی گاڑی کو روکتی تو وہ اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے لیکن ہم اس کی اجازت دینے سے انکار کر دیتے۔ عراق میں ہونے والے تجربات نے ہمیں بتایا تھا کہ انتہا پسند بھی پولیس کی وردی استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم کوئی خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھے۔ پولیس ہمیں گھنٹوں سڑک پر کھڑا رکھتی اور ہم دروازہ بند کر کے اس وقت تک بیٹھے رہتے جب تک کہ امریکی سفارت خانے اور قونصل خانے میں میں تعینات ریجنل سکیورٹی افسر (RSO) ہماری مدد کو نہ پہنچ جاتے۔

کچھ عرصہ قبل پاکستانی پولیس نے ایک معمر خاتون کو بھی گرفتار کیا تھا۔ دیکھنے میں یہ خاتون دادی اماں کی طرح لگتی تھیں۔ یہ خاتون امریکن قونصلیٹ کی نائٹ شفٹ میں کام کرتی تھی۔ پولیس نے اُس پر جاسوسی کے آلات استعمال کرنے کا الزام لگایا۔ پولیس نے اُس سے جاسوسی کے آلات اور ایک کلاشنکوف AK 47 رائفل بھی برآمد کرلی۔ کہانی کی بنیاد ایک ڈیجیٹل کیمرہ تھا جبکہ کلاشنکوف کی کہانی جھوٹ تھی۔ بہرحال پولیس نے برآمدگی کا ثبوت فراہم کر کے کیس درج کرلیا۔ جب پولیس کوئی ثبوت پیش نہ کر سکی تو لاہور ہائی کورٹ نے کیس خارج کرتے ہوئے خاتون کو رہا کرنے کا حکم دیا۔

لاہور شہر کے اردگرد گھومتے ہوئے میں ٹریفک کے پیٹرن پر بھی توجہ دیا کرتا تھا۔ اُس فیصلہ کن دن جب میں سفید سیڈان میں لاہور میں ڈرائیو کر رہا تھا، ٹریفک معمول کے مطابق تھا۔ میں جیل روڈ پر تھا۔ میرے سامنے ایک چوک تھا، جو مزنگ چوک کہلاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا بس سٹیشن دکھائی دیتا ہے جہاں بہت سے بنک اور ریستوران ہیں۔ چوک کے قریب آتے ہی میری رفتار سست ہوگئی۔ میں نے چوک میں ایک ٹریفک پولیس مین کو دیکھا۔ پاکستان میں ٹریفک پولیس کے پاس ہتھیار نہیں ہوتے۔ جب میں سٹاپ تک پہنچا

Scanned with CamScanner

تو میری گاڑی سڑک کے درمیان تھی۔ میرے دائیں اور بائیں کی دونوں لینز گاڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کاروں کے درمیان کی جگہ موٹر سائیکلوں سے بھری تھی۔ بہت سے موٹر سائیکل رکشے بھی رکے ہوئے تھے۔

مجھے یہاں رکے ہوئے دو منٹ ہوئے ہوں گے۔ میں مسلسل گرد و پیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں کم و بیش مطمئن تھا جب ایک سیاہ رنگ کی موٹر سائیکل میرے سامنے آ کر رکی۔ اس پر دو افراد بیٹھے تھے۔ ڈرائیور، جس کا نام بعد میں پتہ چلا کہ فیضان حیدر تھا، نے ہیلمٹ پہنا ہوا تھا۔ دوسرا شخص، محمد فہیم اُس کے عین پیچھے بیٹھا تھا لیکن اُس کے جسم کا رخ میری طرف تھا۔ میں نے اُس کے ہاتھ میں پستول دیکھا لیا تھا۔ پاکستان میں شہریوں کے پاس ہتھیار پائے جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اُنہیں کسی خطرے کا سامنا ہو، یا وہ کسی کے لیے خطرے کا باعث بنیں۔ لیکن جب کوئی کسی مصروف چوک میں سڑک کے درمیان آپ پر پستول تان لے تو پھر تمام معروضات تبدیل ہو جاتی ہیں۔ وہ شخص آپ کے لیے فوری خطرہ بن جاتا ہے۔ جب زیادہ تر افراد کو جان کا خطرہ لاحق ہوتا ہے تو خوف سے اُن کے حواس جواب دے جاتے ہیں، اُن کا ذہن کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ یہ کیفیت اُنہیں لاحق خطرے میں اضافہ کر دیتی ہے۔ اگر وہ بھاگ سکتے ہوں تو وہ اسے ترجیح دیں گے۔ لیکن خوش قسمتی سے مجھے دنیا کے بہترین ٹرینرز سے تربیت حاصل کرنے کا موقع ملا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس موقع پر کیا کرنا ہے۔ میں نے گہرا سانس لیا اور اپنے اعصاب پر پڑنے والے دباؤ کو کم کیا۔ میں اپنے سامنے موجود تمام منظر کی جزویات کو پڑھ رہا تھا۔ ایسے حالات میں عام لوگوں کی توجہ صرف گن پر ہوتی ہے لیکن میں اپنے سامنے 65 انچ کی سکرین کو ایک ٹی وی کی طرح دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے ہر چیز بہت واضح تھی۔ تمام ٹریفک میری نظروں میں تھی۔ اُن افراد نے یونیفارم نہیں پہنی ہوئی تھی، چنانچہ اُن کا تعلق کسی قانون نافذ کرنے

والے ادارے سے تو نہیں تھا۔ میرے سامنے دو نوجوان تھے جن کے پاس گن تھی۔ اب میری توجہ اُس گن پر مرکوز ہو گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وقت کے لمحات سست ہو گئے ہیں۔

میں نے بیک مرر سے دیکھا اور اپنی توجہ آگے کی طرف مرکوز کر لی۔ دائیں، بائیں اور پھر اسی موٹر سائیکل سواروں کی طرف دیکھتے ہوئے میں محتاط ہو گیا تھا۔ موٹر سائیکل بالکل میری کار کے سامنے تھا۔ ہر طرح کے اشاروں کنایوں سے ان کی شناخت ہو چکی تھی۔ میں نے پیچھے بیٹھے شخص کو جیب سے گن نکالتے اور اپنی طرف بلند کرتے دیکھ لیا تھا۔

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

2

ابو حذیفہ

بگ سٹون گیپ، ورجینیا

زندگی آسان نہیں... جب میں نے آنکھ کھولی اور جہاں میں بڑا ہوا تو تبدیل ہوتی زندگی کو دیکھا جو کسی طور آسان نہیں تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ ورجینیا امریکہ کی سب ریاستوں سے الگ پہاڑوں میں گھری ہوئی ریاست ہے۔ یہ ایک ٹھنڈی ریاست ہے جہاں میرے والد کوئلے کی صنعت میں کام کرتے تھے۔ وہ کان کنی کے ایک حادثے کا شکار ہو گئے۔ اُن پر کام کرتے ہوئے سات سو پاونڈ وزنی چٹان گر گئی۔ اُس وقت میری عمر پانچ برس تھی، لیکن اپنے والد کے زخمی ہونے کا منظر میرے ذہن میں آج تک واضح ہے۔

میرے بھائی، بہن اور ماں کے لیے پیسے کی تنگی تھی۔ زندگی بسر کرنے اور ہماری کفالت کرنے کے لیے ہماری والدہ کو تین جگہوں پر کام کرنا پڑتا۔ پیسے کی قلت تھی لیکن میں اور میرا بھائی اور بہن کبھی بھوکے نہ سوئے۔ میں اس بارے میں کبھی نہیں سوچتا تھا کیونکہ کاؤنٹی میں رہنے والے کم لوگ بہت اچھے تھے۔ ان میں سے ایک بڑی تعداد غربت کی لائن کے نیچے تھی۔

لیکن اچھی خبر یہ تھی کہ جب آپ کے ارد گرد ایک جیسے آپ غریب لوگ ہوتے ہیں تو غربت محسوس نہیں ہوتی۔ سب کچھ معمول کے مطابق ہوتا ہے۔ یہ بعد میں، میں نے محسوس کیا کہ میرا خاندان کتنا غریب تھا۔

Scanned with CamScanner

جب میں جوان ہوا تو میں اپنے گریڈ میں جسمانی طور پر تنومند تھا۔ میں ساتویں گریڈ میں تھا جب میں آٹھویں گریڈ کی فٹ بال ٹیم میں شامل ہونے کا اہل ہو گیا۔ میں بہت طاقتور اور تیز رفتار تھا۔ میرے والد میری اتھلیٹکس کی سرگرمیوں کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ میں نے ریسلنگ بھی کی اور سکول ریس میں بھی حصہ لیا۔ لیکن میرے والد صاحب میری مزید کامیابیوں کو نہ دیکھ سکے اور جب میری عمر چودہ سال تھی۔ وہ ہارٹ اٹیک کی وجہ سے فوت ہو گئے۔ مجھے مزدوری کرنی پڑی۔ میری اس وقت عمر پندرہ برس تھی اور میں دس ڈالر فی گھنٹے پر اینٹیں اور بلاک اٹھاتا تھا۔ مزدوری میں اضافہ بھی ہو جاتا جو کبھی میرے زیادہ کام کرنے کی وجہ سے 25 ڈالر اور 50 ڈالر تک پہنچ جاتی۔ یہ سب میں اس لیے کرتا تھا تاکہ ہم ایک ہی میز پر بیٹھ کر کھانا کھا سکیں۔ میں ملنے والا ہر چیک اپنی والدہ کو لا کر دیتا۔ اس دوران میں نے ضلعی اور ریاستی چمپیئن شپ میں کامیابی حاصل کی۔ اس وقت میں گریجویشن کر چکا تھا۔ چنانچہ میں نے ملک بھر میں نوکری کے حصول کی کوششیں شروع کر دیں۔

اس تمام محنت کے باوجود میں جانتا تھا کہ میں اینٹیں اٹھانے کے لیے پیدا نہیں ہوا۔ میں پورا ملک بلکہ دنیا دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں مقامی آرمڈ فورسز کے ریکروٹنگ آفس چلا گیا، لیکن انہوں نے مجھے رکھنے سے انکار کر دیا۔ میں ان کے فوجی معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ میں نے میرین کمانڈوز میں شامل ہونے کی کوشش میں ناکام رہنے کے بعد فوج کے ریکروٹمنٹ آفیسر سے رابطہ کیا۔

میں نے ریکروٹمنٹ آفیسر سے پوچھا کہ آپ کے ہاں کس قسم کی نوکری ہے؟

ریکروٹمنٹ آفیسر نے مجھے بتایا:

''ہر طرح کی..... لیکن سب سے پہلے ٹیسٹ دو، اس کے بعد دیکھیں گے کہ تم کہاں

Scanned with CamScanner

کے لیے فٹ ہو۔"

میں نے ٹیسٹ دیا اور واپس آ گیا۔ آفیسر نے مجھے دوبارہ بلایا اور مجھے میڈیکل کا شعبہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ میں نے حیرانگی سے کہا کہ کیا ڈاکٹر......

"ہاں!"

"لیکن میں ڈاکٹر نہیں بننا چاہتا۔ کیا آپ کے پاس کوئی اور آپشن ہے؟"

"انتظار کرو۔" اس نے اپنی کمپیوٹر سکرین دیکھتے ہوئے کہا۔

"صرف انفنٹری میں پوسٹ خالی ہے۔"

میں نے سوچا اور اپنی اس نئی شناخت کے بارے میں پلاننگ کرنے لگا۔

چند دن کے بعد جب میں اٹھارہ سال کا تھا، تو ہوائی جہاز میں بیٹھ کر جار جیا جا رہا تھا۔ وہاں قلعہ Benning میں سخت ٹریننگ، مشقت، محنت اور مہارت کا ایک طویل دور شروع ہوا۔

میں نے چار سال امریکی فوج میں گزارے۔ وہاں سے فراغت کے بعد میں نے سوچا کہ کالج جاؤں اور فٹ بال ٹیم جوائن کرلوں اور بھرپور آزادی سے سویلین لائف کو انجوائے کروں لیکن سپیشل فورسز نے میری منصوبہ بندی کو چکنا چور کر دیا۔

مجھے ٹاکوما، واشنگٹن کے جنوب میں فورٹ لیوس میں تعینات کیا گیا تھا۔ میری ذمہ داری سپیشل فورسز کے بنیادی مشن میں سے ایک فوجیوں، خاص طور پر غیر ملکیوں کو تربیت دینا تھا۔ اس طرح میری حیثیت ایک انسٹرکٹر کی ہوگئی۔ سپیشل فورسز کی فائرنگ رینج میں فوجیوں کو بتایا اور سکھایا جاتا کہ ہر طرح کے اسلحہ کا استعمال کیسے کرنا ہے؟ سپیشل فورسز کے جوان ہر طرح کے رائفلوں اور ڈھاما کہ خیز بارودی مواد کا استعمال میں اتنے ماہر ہو گئے کہ جس کا مقابلہ شاید ہی کوئی کرسکتا تھا۔ ان تمام چیزوں کے ساتھ ساتھ ہم خوشی کا کوئی موقع بھی ہاتھ

Scanned with CamScanner

سے جانے نہ دیتے اور سب مل کر خوب انجوائے کرتے۔

میں اس دوران سپیشل فورسز کی پیشہ ورانہ مہارت سے بہت متاثر ہوا۔ اس مہارت کو حاصل کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اگلے کئی مہینے میں نے یہ سب کچھ بحیثیت ٹیم لیڈر کے طور پر کیا۔ میں ہر صبح 4:30 پر اٹھ جاتا اور جوانوں کے ساتھ 100 پلز اور 200 پش اپ لگانے کے بعد چھ کلو میٹر تک دوڑ لگاتا۔ اس کے بعد ہم ہمارا دو گھنٹے کا گوریلا ٹریننگ سیشن شروع ہو جاتا۔ شام کو 10 کلو میٹر کی دوڑ اس دن کے اختتام کے ساتھ میری روٹین، فٹ نس کا راز اور سپیشل فورسز کی ضرورت تھی۔ ان معمولات نے میری زندگی کو بہترین شکل دی۔

گوریلا ٹریننگ سیشن کے خاتمے کے بعد میں نے سپیشل فورسز کے انتخاب کے معیار کو جانچنے اور بنانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے خود جوانوں کے ساتھ تین ہفتے کے سخت ترین کورس کا آغاز کیا جس میں جوانوں کو ان کی فٹ نس اور جسم کو اپنی ضرورت کے مطابق کنٹرول کرنے کے لیے اس طرح ڈیزائن کیا کہ ہر جوان 500 میل تک با آسانی بھاگ سکے۔ اس کے علاوہ جوانوں کو نیوی گیشن سسٹم سے آگاہی، بارش میں تیز ترین سفر، مختصر ٹیم کے ساتھ کام، کیمونی کیشن کی فارورڈنگ، معلومات کا حصول اور آگے پہنچانا، پانی کے بھرے کین لے کر دس کلو میٹر تک چلنا، 350 پونڈ وزنی بیگ کمر پر باندھ کر چلنا، کھلی جیپ کے پرزوں اور پہیوں کے ساتھ کوچ کرنا جیسی ٹریننگ شامل تھی۔

اس سیشن میں آدھے جوان نکل جاتے اور کچھ کو دوبارہ یہ سیشنز کرنے کی ضرورت ہوتی۔ ناکام ہونے والوں کو دو چانس دیئے جاتے اور جو پھر ناکام ہو جاتے، انہیں نکال دیا جاتا۔ میں نے اس کورس کی منظوری دی اور خود بھی اس کورس کو پہلی دفعہ میں پاس کیا۔ اگلا چیلنج ایس ایف قابلیت کا کورس تھا، جسے پاس کرنے کے لئے ایک سال سے زائد عرصہ لگا۔ ایک مرحلے میں، ہم نے ہتھیاروں کی حکمت عملی سیکھی۔ پھر مختلف زبانیں سیکھنے کا کورس کروایا

Scanned with CamScanner

گیا۔ میں نے چار مہینے تک فرانسیسی زبان کا خوب مطالعہ کیا۔

اس کے بعد میں فوجی گریڈ اسکول بھتایا گیا، جہاں مزاحمت، بچاؤ اور فراری کورس کیا۔ یہ امریکی فوجی اہلکاروں کو سکھانے کے لئے ڈیزائن کیا گیا ایسا کورس تھا جس میں سکھایا جاتا ہے کہ کس طرح یرغمال بنانے والوں سے بچنا ہے اور اگر یہ ناکام ہو جائے تو کس طرح تحقیقات اور تشدد کا سامنا کرنا ہے۔

سپیشل فورسز کی تربیت جسمانی طور پر، دماغی طور پر، اور جذباتی طور پر تکلیف دہ ہے۔ اس تربیت نے میرے دائیں پھیپھڑوں کو کچھ نقصان پہنچایا۔ یہ 1998 میں ہونے والی چوٹ کا اثر تھا لیکن اس کے پورے اثرات 2001 میں سامنے آئے جب میرے پھیپھڑوں نے اچانک کام کرنا بند کر دیا۔

فوج نے مجھے عارضی معذوری ریٹائرمنٹ کی فہرست میں ڈال دیا اور جواب دیا کہ جب تک میری چوٹ مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوتی، میں اپنے کام پر واپس نہیں آسکتا۔

آپ تصور کر سکتے ہیں کہ میں کس طرح تباہ ہوا۔ میں نے اپنی پوری زندگی بڑے کھیل کے لئے تربیت دی تھی اور آخر میں اسے "سپر باؤل" میں بنا دیا گیا۔

میں نے تجویز کیا کہ میری خدمات انسٹرکٹر کے طور پر لے لی جائیں لیکن میری تجویز رد کر دی گئی۔ میں ربیکا کے ساتھ لیکسنگٹن منتقل ہو گیا۔ یہاں ایسٹرن کینٹکی یونیورسٹی نے دلچسپ کورس شروع کیا جسے ایسٹس پروٹیکشن اینڈ سیکیورٹی کا نام دیا۔ میں پڑھنے میں دلچسپی رکھتا تھا اور کالج کا بہترین سٹوڈنٹ رہا تھا لیکن میں جھوٹ نہیں بول سکتا کہ میں ایک معذور شخص تھا۔ کلاس روم میں بیٹھنے والے سب لوگ خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ واک پر جاتے، بھاگتے دوڑتے اور قہقہے لگاتے اور میں انہیں دیکھتا رہتا۔ میں مایوسی کی شدید لہر میں چلا گیا۔ مجھ پر ڈپریشن کا شدید دورہ پڑا تھا۔ میں مشکل سے صرف چلنے کے قابل تھا۔

Scanned with CamScanner

میں اس دن بہت اداسی محسوس کر رہا تھا جب میں نے ایک آٹھ سالہ بچے کے بارے میں ایک میگزین میں آرٹیکل پڑھا جس کی دونوں ٹانگوں معذور تھیں لیکن وہ آٹھ منٹ میں ایک میل چلتا تھا۔ اس بچے نے کی لگن نے مجھے اپنے پھیپھڑوں کی قوت بحال کرنے میں مدد دی۔ میں نے چلنا شروع کر دیا۔ میں نے پہاڑ پر موٹر سائیکل چلانا شروع کر دی۔ اس طرح کسی بھی مشکلات کے بغیر، میں نے چلنا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ اس معمول کی پیروی کرتے ہوئے، میں اپنے پھیپھڑوں کی صلاحیت میں اضافہ کرنے میں کامیاب رہا۔ 52 فیصد تک کم از کم اور 89 فی صد تک.....

میرا دایاں پھیپھڑا بالکل ٹھیک ہو گیا تو 2003 میں، میں نے سپیشل فورسز کو دوبارہ جوائن کرنے کے لیے درخواست دی۔ میں سمجھتا تھا کہ فوج کی کوئی بھی نوکری ہو، وہ بہت اہم ہوتی ہے، لیکن ڈاکٹر نے میرے کاغذات پر دستخط سے انکار کر دیا۔ میری ملازمت کی پیشکش کو بدل دیا گیا اور مجھے کہا گیا کہ میں انتظامی معاملات کے دفتر میں کام شروع کر دوں، لیکن میں جانتا تھا کہ انتظامی دفتر کے اندر ماحول کس طرح کا تھا۔ یہ ملازمت ان لوگوں کے لیے تھی جو ذمہ داری سے بچنا چاہتے ہیں۔ میری ٹریننگ ایسی نہ تھی۔ اس آفر نے مجھے پریشان کر دیا۔

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

3

کابل، افغانستان

لوگوں کی نظروں میں آرمی کنٹریکٹر یا فوجی ٹھیکیدار کی تشریح بڑی عجیب کی جاتی ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ دراصل کرائے کی بندوق بردار ملازم ہیں جن سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ غلط فہمی ہے۔ میں اس کے بارے میں جتنا جانتا ہوں وہ عام پائے جانے والے تاثر سے بالکل مختلف ہے۔ ملٹری کنٹریکٹر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کے فوجی کیریئر سے آگے کی ایسی ذمہ داری ہے جسے وہ ملک کے لیے انجام دے رہے ہیں۔ اسی لیے امریکہ جن ملٹری کنٹریکٹر کمپنیوں سے اس ضمن میں معاہدے کرتا ہے، وہ امریکہ کے بہترین مفاد کے لیے کام کرنے والی کمپنیوں میں سے ایک ہوتی ہیں۔ اسی لیے میں نے ایک فوی ٹھیکیدار کے طور پر اپنا کیریئر شروع کیا اور اس طرح اپنے ملک کی حفاظت کی کوشش کی۔ اس کا مقصد دہشت گردی کے خطرے کے پیش نظر اپنے ملک، شہریوں کی حفاظت اور امریکی آئین کی حمایت، دفاع اور پاسداری تھا۔

امریکی فوج کے نجی ٹھیکیداروں کا استعمال بڑا ہی پرانا ہے۔ جارج واشنگٹن نے اپنی فوج کے لیے امریکی انقلاب کے راستے پر رواں قوم کے شہریوں کو ٹرینیں چلانے، عارضی رہائش گاہوں کی تعمیر، کھانا پکانے کا کام سونپا۔ سویلین کو ہائر کرنے کے اس طرح کے انتظامات جنگ کے دونوں میں اگرچہ کثرت سے کئے جاتے ہیں لیکن اب بدلتے حالات

Scanned with CamScanner

کے پیش نظر اس کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔ ویت نام کی جنگ کے دوران امریکہ نے اپنے بزنس میتوں کی ایک ایمپائر کھڑی کی۔ اسے ویت نام بلڈرز کا نام دیا اور اسے 380 ملین ڈالر کا کنٹریکٹ دیا۔ اس کنسورشیم کو جنوبی ویت نام میں ایئر پورٹ، روڈز اور ہسپتال بنانے کا ٹھیکہ دیا گیا۔

ویت نام بلڈرز کی مشہور اور بڑی کمپنی براون اینڈ روٹ نے 1937 میں ایک معاہدے کے تحت مارشل فورڈ ڈیم کی تعمیر کا آغاز کیا۔ بعد میں اس ڈیم کا نام تبدیل کر دیا گیا اور نیا نام منزفیلڈ ڈیم رکھا گیا۔ اس منصوبے کا سارا عمل کانگریس کے رکن جانسن نے انجام دیا۔ جب جانسن دو دہائیوں بعد وائٹ ہاؤس سے رخصت ہوئے تو اس کے بعد بر ون اینڈ روٹ نامی کمپنی کو بڑے تعمیراتی پراجیکٹ کے ٹھیکے اسی طرح ملتے رہے۔ اس میں شبہ نہیں تھا کہ کمپنی نے کئی بڑے تعمیراتی منصوبے مکمل کیے تھے لیکن کمپنی کی اس ترقی کو جانسن کی مہربانی قرار دیا گیا۔

بر ون اینڈ روٹ کی مخالف کمپنی ایلیواس کے نمائندے ڈونالڈ ایچ رمزفیلڈ نے 1996 میں کمپنی اور جانسن کے درمیان تعلقات کی تحقیقات کیں۔ 30 سال بعد رمزفیلڈ نے ہی امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کے سیکرٹری دفاع کے طور پر خدمات انجام دیتے ہوئے پینٹاگون میں ایک نئی پالیسی متعارف کرائی، جس میں تقریبا ہر پہلو میں نجی شعبے کے ٹھیکیداروں کے عمل دخل کر بڑھا دیا۔ اس اقدام نے رمزفیلڈ کے سابقہ نظریات کے لیبل پر ایک نیا لیبل لگا دیا۔

رمزفیلڈ کے اقدام نے جارج ایچ ڈبلیو بش کے سیکرٹری دفاع، ڈک چینی کی طرف سے پیش کردہ تجویز کی حمایت کی۔ ڈک چینی نے 1992 میں براون اینڈ روٹ کو باقاعدہ طور پر 9.3 ملین ڈالر کا ایک کنٹریکٹ دیا تھا جس کے تحت کمپنی نے امریکی فوج کو لاجسٹک

Scanned with CamScanner

سپورٹ مہیا کرنی تھی۔

Dyn کارپوریشن انٹرنیشنل کو دوسرے معاہدے سے نوازا گیا۔ اسی کمپنی میں مجھے 2004 میں افغانستان میں 600 ڈالر روزانہ کے حساب سے ملازمت کی پیش کش کی گئی۔

یہ وقت میرے اور میرے خاندان کے امریکی ٹیکس دہندہ کے طور پر بہت اچھا تھا۔ 2005 میں واشنگٹن ڈی سی میں ایک سمپوزیم میں دنیا کی سب سے بڑی ملٹری کنٹریکٹر کمپنی بلیک واٹر کے سی ای او اور سربراہ ایرک پرنس نے کہا کہ فوج کے مستقل سائز کو بڑھانے کے بارے میں محکمہ دفاع میں مکمل اتفاق ہے۔ ہم 30 ہزار فوجیوں کی تعداد بڑھانا چاہتے ہیں۔ اچھی بات ہے۔ ان پر 3.6 بلین ڈالر سے چار بلین ڈالر تک خرچہ آئے گا۔ میرا حساب کہتا ہے کہ ہر فوجی پر ایک لاکھ 35 ہزار ڈالر خرچ ہوں گے۔ ہم اسے کم کر سکتے ہیں۔

ان تمام تر اقدامات میں جنگ لڑنے کے لئے کنٹریکٹرز سے فوجی ریشو بڑھائی جائے تو یہ جنگ لڑنے کا آسان اور سستا ترین حربہ ہے۔ 2006 کی کانگریس ریسرچ رپورٹ کے مطابق 2005 میں عراق میں ایک امریکی فوجی پر 4 لاکھ ڈالر خرچ ہوئے۔ یہ رقم بڑھ کر 6 لاکھ ڈالر تک پہنچ گئی جس کا مطلب ہے کہ سال میں 1.3 ملین ڈالر کا اضافہ..... امریکہ دو محاذوں پر جنگ میں شدت لانے کا خواہاں تھا۔ ایک عراق اور دوسرا افغانستان۔ اب سوچا جائے کہ 2 لاکھ ڈالر میں اگر ملٹری کنٹریکٹر اس ضرورت کو پورا کردے تو کیا مضائقہ ہے۔ یہ کنٹریکٹرز بھی امریکی فوج ہی کے تھے۔ اس لیے کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا۔

افغانستان کے پہلے دورے کے دوران، میں اس ٹیم کا حصہ تھا جس کی بنیادی ذمہ داری حامد کرزئی کی حفاظت تھی۔ حامد کرزائی اپنے ملک کے پہلے جمہوری طور پر منتخب ہونے والے صدر بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ روانی سے انگلش بولتے اور اس کے علاوہ چار

دیگر زبانیں بھی جانتے تھے۔ کرزئی نے اپنی عمر کا کچھ حصہ یورپ اور امریکہ میں بھی گزارا تھا۔اس لیے وہ امریکہ کے لیے قابل قبول تھے۔

کرزئی 5 ستمبر 2002 کو اپنے آبائی شہر قندھار میں اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میں آئے گورنر گل آغا شیرازی کو چھوڑ کر جا رہا تھا کہ محل کے ایک گارڈ نے پستول نکالا اور کرزئی کی طرف رخ کر کے فائر کر دیا۔ فائرنگ کے تبادلے میں شارزئی اور ایک امریکی سپیشل آپریشن آفیسر زخمی ہو گئے۔ بحریہ سیلر جو کرزئی کی سیکورٹی پر تھی، انہوں نے قاتلوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

اس واقعے کے بعد سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اس ٹیم کو پرائیویٹ سیکورٹی کنٹریکٹرز کی ٹیم کے ساتھ تبدیل کر دیا جسے ڈپلومیٹک سیکورٹی سروسز سنبھالتی تھی۔اس تبدیلی کے ساتھ میرا نام اس فہرست میں سب سے اوپر آ گیا جنہیں پرائیویٹ سیکورٹی فورس کے طور پر ہائر کیا جا سکتا تھا۔ میں جلد ہی اس معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد کابل سے اڑ گیا اور اپنی نئی ٹیم میں شمولیت اختیار کر لی۔ ہماری بنیادی ذمہ داری حامد کرزئی کی حفاظت تھی۔ایک بار حامد کرزئی کو سابق مجاہد لیڈر اسماعیل خان سے ملنا تھا۔اسماعیل خان نے 1980 کی دہائی میں روس کے خلاف سی آئی اے کی طرف سے سپانسرڈ جہاد میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

اسماعیل خان نے صوبہ ہرات کے گورنر کے طور پر اس علاقے پر ایسے حکمرانی کی، جیسے یہ اس کی اپنی ذاتی سلطنت تھی۔ حامد کرزئی چاہتا تھا کہ اسماعیل خان اس کے نائب صدر کے طور پر کام کرے۔ یہ ملاقات اسی مقصد کے لیے تھی۔ اسماعیل خان نے اصرار کیا کہ ان کی ملاقات پہاڑوں میں گھرے اس کے کمپاؤنڈ میں ہو۔ جب ہم اپنے گاڑیوں کے ساتھ اسماعیل خان کی رہائش گاہ کے صحن میں پہنچے تو AK-47 رائفلوں نے ہمیں سلامی دی جس سے ہم محتاط ہو گئے۔ اسماعیل خان کے لوگ اس عمارت کی چھت پر کھڑے تھے اور

ان کے ہتھیاروں کا رخ ہماری طرف تھا۔ ہم بھی مسلح تھے، لیکن اسماعیل خان کے گارڈز کو نفسیاتی فائدہ حاصل تھا۔

ایک ڈی ایس ایس ایجنٹ اس دن آفیسر انچارج تھے۔ وہ بہت پریشان ہوئے اور انہوں نے فائرنگ کا حکم دے دیا۔ کشیدگی کو ختم کرنے کے لیے کوششیں ہوئیں لیکن افغان نعرے لگاتے ہوئے ہمیں مشتعل کر رہے تھے۔ ہمارے آفیسر انچارج نے ایم 4 رائفل اٹھائی اور جارحانہ انداز میں چھت پر جانے لگے۔

یہ ایک انتہائی کشیدہ صورتحال تھی اور میں سب کچھ کر سکتا تھا۔ میں اپنے اندرونی جذبات کو اپنے بیرونی سفارتکار کو بہتر بنانے استعمال میں رکھتا تھا۔ میں پرسکون رہنے کی کوشش کرتا تھا، لیکن میرے احکامات کے بعد ڈی ایس ایس ایجنٹ کا حکم نہیں مانا گیا۔ ہمارے ٹیم کے رکن نے اس ڈی ایس ایس ایجنٹ سے بندوق لے لی اور اسے ایک گاڑی میں دھکیل دیا۔ اس طرح ہم کامیابی سے ایک ممکنہ تباہی کو ٹالنے میں کامیاب رہے۔ کیونکہ ہمیں یہ سکھایا گیا تھا کہ اگر آپ کے پاس خود کو ایک خطرناک واقعہ سے نکالنے کا ایک موقع ہے تو اسے فوری عمل پذیر کریں۔ جسم کو بیگ میں گھر بھیجنے سے بہتر ہے کہ کسی اور روز لڑ لیا جائے، یہ سبق ہے جو میں کبھی نہیں بھول سکا۔

Scanned with CamScanner

ابو حذیفہ

4

مزنگ چوک، لاہور، پاکستان

(27 جنوری، پہلا دن)

اب میں واپس مزنگ چوک کے واقعے پر آتا ہوں۔ افغانستان کے بعد میری منزل لاہور تھی۔ 27 جنوری 2011 کو میں نے اپنے آپ کو بڑی مشکل میں محسوس کیا۔

جب اس موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھے سوار نے میری طرف گن اٹھائی تو میں ایک مشکل صورت حال کا سامنا کر رہا تھا۔ میرا اور گن کا فاصلہ دس فٹ سے زیادہ نہ تھا۔ اگر کھلی سڑک ہوتی تو میں ایکسیلیٹر دبا کر نکل جاتا لیکن سڑک ٹریفک سے بھری ہوئی تھی، چنانچہ گاڑی بھگا لے جانے کا آپشن موجود نہیں تھا۔ اگر میں اپنی مخصوص SUV میں ہوتا تو مجھے کچھ نہ کرنا پڑتا۔ میں اُن کی طرف مسکرا کر دیکھتا کیونکہ اُن کی چلائی گئی ہر گولی گاڑی پر بے اثر ہوتی۔ اس کے شیشے ہر ممکن حد تک بلٹ پروف تھے۔ لیکن میں ایک عام سیڈان میں سوار تھا۔ اس وقت شام کا ہلکا ہلکا اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس موقع پر میرے پاس اپنی ٹریننگ پر انحصار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ میری ٹریننگ نے مجھے سکھایا تھا کہ اگر میری جان کو خطرہ لاحق ہو تو کیا کرنا ہے۔ چنانچہ میں نے وہی کچھ کیا جو مجھے سکھایا گیا تھا۔

گن کی نالی میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ کو غیر محسوس انداز میں حرکت دیتے ہوئے اپنی سیٹ بیلٹ کو کھول دیا اور ہولسٹر میں سے اپنی گن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

Scanned with CamScanner

گن نکالنے کے لیے مجھے وقت ضائع نہیں کرنا پڑا۔ میں نے اپنی ٹی شرٹ کا بٹن کھولا اور اس میں شاید ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت لگا ہوگا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میں نے ایسا کس طرح کیا؟ بات یہ ہے کہ میری تمام عمر گن چلانے میں ہی بسر ہوئی تھی۔ اپنے بھائی، بہن کے ساتھ شوٹ، شوٹ کھیلتے ہوئے سارا بچپن گزارا۔ اس کے بعد بھی زندگی سے لے کر فوج تک، گنز سے میرا خاص تعلق رہا تھا۔ میرے افسران اور میرے ٹرینر جانتے تھے کہ میں گن استعمال کرنے میں کتنا برق رفتار تھا۔ اگر مزنگ چوک پر مجھ سے ٹکرانے والے نوجوان بھی یہ بات جانتے تو شاید وہ کبھی میرے سامنے آنے کی کوشش نہ کرتے۔ اُن کے پاس اس شام کرنے کے لیے بہت سے کام نکل سکتے تھے۔ اُن کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ میں اتنی تیزی سے گن نکال لوں گا۔ میری گن مکمل طور پر آٹو میٹک تھی۔ جیسے ہی میرا ہاتھ گاڑی کے اسٹیرنگ سے بلند ہوا، میں نے فائر کر دیا۔ میرے ہاتھ میں برانڈ نیو گلاک 17 گن تھی جو مجھے لاہور پہنچنے پر مہیا کی گئی تھی۔ میرے پاس دیگر ضروری اشیا بھی تھیں، جیسا کہ جی پی ایس، کیمرہ، فون اور رمیٹرولا ریڈیو۔ یہ اشیا ہر آرمی کنٹریکٹر کو دی جاتی ہیں۔

مجھے برانڈ نیو گلاک 17 گن دی گئی۔ اس صبح جب میں اپنی رہائش گاہ سے باہر آیا تو میری گن کے میگزین میں سترہ گولیاں تھیں اور ایک چیمبر تھا۔ جب میں مزنگ چونگی میں اپنا دفاع کر رہا تھا تو میں نے دس گولیاں دو افراد کو ماردیں اور دو یا تین سیکنڈز کے وقفے میں تمام خطرات کو ختم کر دیا۔

Scanned with CamScanner

ابو حذیفہ

5

مزنگ چوک، لاہور، پاکستان

مزنگ چوک میں اُس شام میں دو یا تین سیکنڈ کے قلیل وقفے میں میری گن سے دس گولیاں نکلیں اور تمام کھیل ختم ہو گیا۔ میرا نشانہ بہت اچھا تھا۔ اگرچہ گولیاں کار کی سکرین میں سوراخ بناتی ہوئی اپنے ہدف کی جانب گئی تھیں لیکن اُن میں سے کوئی بھی نشانے سے نہ بھٹکی۔ سڑک پر بہت رش تھا لیکن کوئی اور شخص زخمی نہیں ہوا۔ اگر نشانہ ذرا سا بھی چوک جاتا تو بہت سے دیگر افراد کی جان بھی چلی جاتی۔

ہلاک ہونے والوں کی پوسٹ مارٹم رپورٹ ظاہر کرتی تھی کہ بائیک پر پیچھے بیٹھے محمد فہیم کو پانچ گولیاں لگیں۔ ایک بائیں ٹانگ پر، ایک دائیں ٹانگ پر، دو سینے میں اور ایک سر کے پیچھے۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ موٹر سائیکل چلانے والے فیضان حیدر کو پانچ گولیاں جسم کے پیچھے لگیں اور وہ شدید زخمی ہوا تھا۔ اُن کی موٹر سائیکل سڑک پر دیگر بائیکس اور رکشوں کے درمیان گر گئی تھی۔ فیضان حیدر نے بھاگنے کی کوشش ضرور کی لیکن بری طرح زخمی ہونے کی وجہ سے دور تک نہ جا سکا، اور میری کار سے تقریباً تیس فٹ کے فاصلے پر گر کر مر گیا۔

کسی بھی شخص کی جان لینا افسوس ناک عمل ہے لیکن جب ایک شخص مجھ پر پستول تان لیتا ہے تو پھر یہ آپ کی چوائس ہے کہ آپ مرنا پسند کریں یا جان بچانا، اس وقت یقینی طور پر

Scanned with CamScanner

جان بچانا ہی سب سے اہم ہو جاتا ہے اور جان بچانے کے لیے اس فوری خطرے کا تدارک کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہی میں نے کیا۔ میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ جہاں بھی میری تعیناتی ہو، وہاں میں اپنا کام کر کے جلد سے جلد اپنے گھر پہنچوں اور اپنی بیوی رابیکا اور بچوں کے ساتھ وقت گزاروں۔

جب میں نے آخری گولی چلائی تو اپنے اردگرد دیکھا کہ مجھے کوئی اور خطرہ تو نہیں۔ میری کار کی ونڈ سکرین کو نقصان پہنچا تھا۔ اس لیے میں واضح طور پر نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ اس لیے میں نے دروازہ کھولا اور تمام مقام کا جائزہ لیا۔ بہت سے لوگ وہاں جمع ہو رہے تھے لیکن اب مجھے کوئی خطرہ نہ تھا۔ میرے اردگرد بہت سے موٹر سائیکل سوار اپنی موٹر سائیکلیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ انہوں نے جب لاشیں اور خون دیکھا تو انہوں نے دوڑیں لگا دیں۔ پاکستان میں یہ عام دستور ہے کہ اس طرح کے کسی حادثے کی صورت میں لوگ بھاگ جاتے ہیں۔

جلد ہی وہ مقام پرسکون ہو گیا، لیکن میں جانتا تھا کہ وہ سکون عارضی ہے۔ وہاں سے امریکی قونصلیٹ تین میل کی دوری پر تھا۔ میں نے فوراً اپنے سفری بیگ سے کیمرہ نکالا اور فہیم کی تصاویر بنائیں۔ کچھ آدھے جسم کی اور کچھ اس کی پوری باڈی کی، میں نے ایک ایسی تصویر بھی بنائی جس میں اس کے ہاتھ میں گن صاف نظر آ رہی تھی۔ میں نے تصویر کو "زوم" کیا تو گن اور نمایاں ہو گئی اور اس تصویر میں اس کی ایک انگلی بھی ٹریگر پر نظر آنے لگی۔ میں مقامی حکام کے لیے کچھ ثبوت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہ روسی ساختہ Tokarev گن تھی جو پاکستان میں عام پائی جاتی ہیں۔

مجھے میرے دوست نے ایک بار بتایا تھا کہ اگر تمہارا مقابلہ دس آدمیوں سے جن میں سے نو کے پاس AK47 رائفلیں اور دسویں کے پاس Tokarev گن ہے تو سب سے

Scanned with CamScanner

پہلے Tokarev گن والے کو مارو کیونکہ یہ وہ ہتھیار ہے جو ان سب میں سب سے زیادہ خطرناک ہے۔

محمد فہیم کو مجھے ہلاک کرنے کے لیے صرف ایک گولی چلانے کی ضرورت تھی۔ اگر وہ ماہر ہوتا تو اس کے لیے ایک سیکنڈ کا ہزارواں حصہ درکار تھا۔ میں نے کیمرہ واپس کار میں رکھا۔

اتنی دیر میں ٹریفک کنٹرول کرنے والا پولیس اہل کار وہاں آیا، اُس نے حیرت سے گری ہوئی موٹر سائیکل اور لاشوں کو دیکھا۔ میں نے اپنا سفارتی پاسپورٹ اس کے سامنے لہرایا اور کہا کہ میں امریکی سفارت کار ہوں اور امریکی قونصل خانے جانا چاہتا ہوں، لیکن وہ انگریزی نہ سمجھ سکا۔ مجھے نہ اردو آتی تھی نہ پنجابی۔ وہ کچھ بول رہا تھا اور میں کچھ ..... دونوں کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ چہرے سے وہ کافی کنفیوز لگ رہا تھا۔

میں نے اسے فہیم کے ہاتھ میں موجود پستول دکھایا۔ میں نے سوچا کہ اسے ساری تفصیل سے آگاہ کروں۔ ٹریفک اہلکار نے گن اس کے ہاتھ سے نکالی اور محفوظ کر لی۔

اتنی دیر میں بہت سے لوگ میری کار کی طرف بڑھنے لگے لیکن اُن کا انداز جارحانہ نہیں تھا۔ تاہم میں پاکستانی ہجوم کے رویے کو جانتا ہوں۔ جیسے ہی پولیس اہل کار نے دوسری طرف منہ کیا، میں اپنی گاڑی میں بیٹھا اور دروازے بند کر لیے۔ میں نے ریڈیو آن کیا۔ مجھے فوری مدد کی ضرورت تھی اور میں قونصل خانے سے رابطہ کرنا چاہتا تھا۔

مجھے یاد تھا کہ دنیا بھر میں سکیورٹی کنٹریکٹرز پر حملے ہوتے رہتے ہیں۔ عراق کے شہر فلوجہ میں اسلامی انتہا پسندوں نے بلیک واٹر کے لوگوں پر حملہ کیا اور ان میں سے دو کو ہلاک کر دیا۔ فلوجہ کے واقعے کے بعد 2004 میں عراقی اسلامی انتہا پسندوں نے بلیک واٹر کے کسی بھی کنٹریکٹر کو مارنے والوں کے لیے 5 ہزار ڈالر انعام کا اعلان کیا۔ اطلاعات کے مطابق میرے آخری دورہ پاکستان کے دوران کشمیر میں ہندوؤں کے خلاف جہاد کرنے

Scanned with CamScanner

والے پاکستانی گروپ لشکر طیبہ نے بلیک واٹر کے لوگوں کو مارنے والوں کے لیے اسی طرح کے انعام کا اعلان کیا تھا۔ اس تفصیل میں کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون کیا کر رہا ہے؟ یہ بلیک واٹر کا ہے یا نہیں.... اگر وہ امریکی ہے تو اسے.... 27 جنوری 2011 کو میرا تعاقب کرنے والے اور مجھے گن دکھانے والے فہیم اور فیضان لشکر طیبہ کے لوگ تھے؟ یہ ممکن بھی تھا اور نہیں بھی..... میں جس جگہ اور مقام پر تھا، وہاں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

مجھے فوری مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے امدادی بیس سے رابطہ کیا۔

''بیس، میں کراس بونز ہوں۔''

کراس بونز میرا شناختی نام تھا۔ کسی بھی ایمرجنسی صورت کی صورت میں مجھے اسی طرح رابطے کی ہدایت کی گئی تھی۔

بیس نے مجھے شناخت کیا اور کہا: ''ہاں بولو کیا بات ہے؟''

میں نے دو لوگوں کو مار دیا ہے۔ مجھے فوری مدد کی ضرورت ہے۔''

''کراس بونز! تم کیا کہہ رہے ہو؟ دوبارہ تفصیل بتاؤ۔'' مجھ سے پوچھا گیا۔

موٹر سائیکل پر سوار دو لوگ ایک چوک پر میرے سامنے آ گئے اور مجھے گن دکھائی۔ میں نے انہیں مار دیا ہے۔ مجھے مدد چاہیے کیونکہ یہاں کچھ برا ہو سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا نام بھی پاکستان کی گلیوں میں ہلاک ہونے والوں میں شامل ہو جائے۔''

گن شوٹنگ کا سن کر فوراً ہی میرے چیف لائن پر آ گئے۔ اتنی دیر میں، میں نے جی پی ایس بھی آن کر لیا۔ چیف نے مجھ سے پوچھا۔

''کراس بونز! تم کہاں ہو؟''

''مزنگ چونگی اور جیل روڈ کے سنگم پر... فیروز پور روڈ....''

''مجھے تفصیل بتاؤ۔'' چیف نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

میں نے دو لوگوں کو مار دیا ہے۔ یہ اب پرسکون ہیں، لیکن لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے۔ مجھے خطرہ ہے۔ یہ لوگ خوش نظر نہیں آ رہے۔ اس لیے مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ فوراً ٹیم بھیجیں۔"

جس وقت میں بیس میں چیف سے مخاطب تھا، میری نظر ہجوم پر بھی تھی۔ جب میں تصاویر بنانے کے لیے کار سے نکلا تھا تو کار نہ تو گیئر میں تھی اور نہ ہی مجھے ہینڈ بریک لگانا یاد رہا۔ چنانچہ وہ ڈھلوان پر آگے کی طرف بڑھ گئی، یہاں تک کہ اس کا اگلا بمپر اس سے اگلی کار کے پیچھے بمپر سے لگ گیا۔ جب اگلی کار نے حرکت کی تو میری کار بھی اُس کے ساتھ جڑ گئی۔ میں جو وہاں سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا، یہ دیکھ کر اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ لوگوں کا ہجوم میری کار پر مکے مار رہا تھا۔ وہ غصے میں تھے۔ میں نے لوگوں کے ہجوم کی طرف دیکھا۔ ان میں سے کچھ نیچے گری ہوئی موٹر سائیکلوں کے پاس کھڑے تھے اور فہیم کی لاش کی طرف اشارے کر رہے تھے۔

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

6

پرانی انارکلی بازار، لاہور

(پہلا دن)

جب میں چیف سے باتیں کر رہا تھا تو اس وقت ہمارا ٹیم لیڈر Z ہماری باتیں سن رہا تھا۔اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مزنگ چونگی میں کیا واقعہ ہوا ہے۔اس نے ایگل آئی کو کال کی جو میرا ٹیم ممبر تھا۔

ایگل جم جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا اور اپنے کمرے سے باہر شارٹس اور ٹی شرٹ میں بیٹھا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' اس نے Z سے پوچھا۔

''ر ے مصیبت میں ہے۔ہمیں اس کی مدد کرنے کی ضرورت ہے۔چلو۔''

وہ تیزی سے سیڑھیاں اترے اور SUV میں جا کر بیٹھ گئے۔Z ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا۔انہوں نے گاڑی کا گیئر نکالا اور یہ جا اور وہ جا.... یہاں ان سے ایک غلطی ہوئی۔وہ اگرچہ اپنے دوست اور ٹیم ممبر کو بچانے آ رہے تھے لیکن انہوں نے اپنے GPS نہیں لئے جس سے میری لوکیشن کی نشاندہی ہو سکتی تھی۔

اگر وہ GSP سے کام لیتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ میں کہاں ہوں۔اس کے بجائے

Scanned with CamScanner

انہوں نے نیوی گیشن سسٹم سے کام لیا۔اس سسٹم سے ان کا مجھ تک پہنچنا اور مشکل ہو گیا۔رش کی وجہ سے وہ میری لوکیشن نہیں جانتے تھے۔انہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے؟

اتنی دیر میں ہجوم نے میرے کار پر مکے برسانا شروع کر دیے تھے۔ایک نوجوان نے سکرین توڑ دی اور ہاتھ بڑھا کر مجھے اندر سے پکڑ لیا۔کچھ نے مجھے پکڑ کر مارنا شروع کر دیا۔میں جانتا تھا کہ اگر میں نے کچھ نہ کیا تو یہ مشتعل ہجوم مجھے یہیں مار دے گا۔مجھے یہاں سے نکلنا تھا۔اگر میں کچھ نہ کرتا تو مشتعل ہجوم نے مجھے گھسیٹ کر باہر نکالنا تھا اور لاہور کی سڑکوں پر مارنا تھا۔

میں نے سیڈان کو پہلے گیئر میں ڈالا اور ہجوم میں سے گزرنے کی کوشش کرنے لگا۔مشتعل ہجوم میری کار کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا اور میرا اور ہجوم کا فاصلہ کچھ قدموں کا ہی تھا۔میں سڑک کے دائیں طرف مڑنا چاہتا تھا لیکن نہ مڑ سکا۔میرے سامنے والی کار نے یوٹرن لیا تو مجھے گاڑی مزید آہستہ کرنا پڑی۔میرے سامنے دائیں طرف مڑنے کی چوائس نہیں تھی۔اتنی دیر میں ایک موٹر سائیکل سوار میرے قریب پہنچ گیا۔اس نے میری گاڑی کے بمپر پر مکے مارنے شروع کر دیئے اور اردو میں مجھ پر چلانا شروع کر دیا۔میں نے اسے دھکا دینے کی کوشش کی۔میں آگے بڑھنے میں کامیاب تو ہو گیا لیکن کئی مصیبتیں منتظر تھیں۔میرا منصوبہ مال روڈ کراس کر کے قونصل خانے جانے کا تھا۔مجھے یقین تھا کہ میں وہاں محفوظ رہ سکتا ہوں۔اس صورت حال کو سنبھالنے کے لئے میں RSO پر بھروسہ کر سکتا تھا۔کچھ دیر کے بعد مجھے راستہ مل گیا اور میں نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔مال روڈ تک جانے کے لیے مجھے انارکلی بازار کی تنگ گلیوں میں سے گزرنا تھا۔یہاں گاڑیوں اور لوگوں کا ایک ہجوم تھا۔انارکلی میرے اور مال روڈ کے درمیان آخری رکاوٹ تھی۔اگر میں انارکلی

Scanned with CamScanner

کراس کر لیتا تو میں مال روڈ کے ذریعے قونصل خانے پہنچ سکتا تھا۔ پرانی انارکلی کراس کرنے کا یہ فاصلہ سو گز سے زیادہ نہیں تھا لیکن جب راست میں لوگ حائل ہوں تو یہی فاصلہ سومیل کا بھی ہوسکتا ہے۔

اچانک میرے سامنے ایک معمر خاتون ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ میں نے دونوں ہاتھ ہارن پر رکھے، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ سڑک کے کنارے پھل بیچنے والوں کی ریڑھیاں تھیں۔ اس کے علاوہ سڑک کے دونوں اطراف پیدل چلنے والے لوگوں کا ہجوم تھا۔ میں نے اپنی گاڑی سے اس کی گاڑی کو پش کیا۔ خاتون نے آئینے میں سے مجھے دیکھا اور اشارے سے یہ کہا کہ آپ نہیں دیکھ سکتے کہ میں یہاں خریداری کر رہی ہوں۔

اتنی دیر میں شوٹنگ کی جگہ سے میرا تعاقب کرنے والا موٹر سائیکل سوار مجھ تک پہنچ گیا۔ اُس نے اردو میں ہجوم سے مخاطب ہو کر چلانا شروع کر دیا۔ شاید اس نے انہیں میری کارروائی کے بارے میں بتایا تھا۔ تھوڑی دیر میں سینکڑوں افراد جمع ہو گئے۔ وہ میری کار پر حملہ کر رہے تھے۔ کسی نے ایک پتھر پھینکا اور کار کا پچھلا شیشہ بھی توڑ دیا۔ میرے سامنے اب اور کوئی آپشن نہ تھا سوائے اس کے کہ بوڑھی عورت کی کار کو راستے سے ہٹاؤں اور کسی طریقے سے نکل جاؤں۔ لیکن یہ اس کار سے ممکن نہیں تھا۔ اگر میں SUV چلا رہا ہوتا تو یہ کام آسان تھا۔ میں نے آخری حربے کے طور پر زور لگایا۔ گاڑی نے دھوکہ دیا اور زیادہ ریس دینے سے وہ بند ہو گیا۔

اتنی دیر میں ہجوم میں سے ایک آدمی نے میری طرف والی کھڑکی توڑی اور مجھے مارنا شروع کر دیا۔ کسی نے میرے چہرے پر لات ماری۔ میرے پاس گن تھی لیکن یہ موقع گن استعمال کرنے کا نہیں تھا۔ مجھ پر بھی کنٹریکٹ کے مطابق کچھ قوانین کی پابندی لازم تھی اور پھر ہر کام کا ایک موقع اور وقت ہوتا ہے۔ میں بس ہاتھوں کے استعمال سے جتنا بچنے کی

Scanned with CamScanner

کوشش کر رہا تھا۔ اگر میں گن نکالنے کی کوشش کرتا تو وہ اتنے زیادہ تھے کہ مجھ سے گن آسانی سے چھین سکتے تھے۔ میں ان سے جتنا بچنے کی کوشش کرتا، وہ مجھے اتنا ہی پیٹ رہے تھے۔ اس موقع پر مجھے اپنے ایک انسٹرکٹر کے وہ اسباق یاد آ گئے جو ایسے مواقع سے نمٹنے کے لیے دیئے گئے تھے۔

میرے سامنے واحد امید میری مدد کو آنے والی SUV تھی جسے ایگل چلا رہا تھا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ وہ جیل روڈ پر ٹریفک میں پھنس گئے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر ریڈیو پر انتہائی تشویش ناک عالم میں پیغام بھیجا۔ ''کہاں ہیں؟''

''ہم تمہارے قریب ہیں۔''

لیکن مجھے نہیں پتہ تھا کہ Z اور ایگل بھی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ وہ جیل روڈ پر آئے اور تیز رفتاری کے باعث ٹریف وال کو ٹکر دے ماری۔ ٹریفک بھی بہت تھی۔ ایگل نے انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے انتظار کرنے کی بجائے میڈین پر اور سڑک کے غلط طرف پر SUV چلانی شروع کر دی۔ انہوں نے کافی فاصلہ طے کیا۔ لیکن سامنے گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کے آنے سے وہ پھنس گئے۔ ایک موٹر سائیکل سوار SUV کو نہ دیکھ سکا۔ یہ موٹر سائیکل عبادالرحمان چلا رہا تھا اور وہ کاسمیٹکس کا کاروبار کرتا تھا۔ ایگل آئی نے بریک لگائی لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ عبدالرحمن کا خون سڑک پر دور تک پھیل گیا۔

میری حالت اور خراب ہو رہی تھی کیونکہ انہوں نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ ایک آدمی کے دروازہ کھولنے کے بعد میں نے اسے بند کرنے کی کوشش کی اور اس کا ہاتھ اور انگلیاں دروازے میں آ گئیں تو میں نے انہیں دروازے کے ساتھ کچل دیا۔ میں نے دروازہ پھر بند کر لیا لیکن اس وقت ہجوم میں سے کسی نے پیچھے کا دروازہ کھول دیا۔ میں نے پھر وہی کوشش کی۔ ہر بار کوئی دروازہ کھلنے پر مجھے وہی عمل دوہرانا پڑا۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ عمل میں

Scanned with CamScanner

نے کتنی بار کیا۔ ہر بار میں دروازہ بند کرنے اور لاک کرنے میں کامیاب رہا۔

اس وقت تک صورت حال انتہائی خوفناک ہو چکی تھی۔ بالا آخر ہجوم نے مجھے کار سے باہر کھینچ نکالا اور مجھے مارنے لگا۔ اتنی دیر میں ایک پولیس اہل کار وہاں آ گیا۔ اُسے دیکھ کر میرے دل میں امید کی کرن روشن ہوئی۔ وہ مجھے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ لوگوں نے اُسے اردو میں کچھ کہا تو اُس نے اُنہیں سمجھایا کہ اس کے پاس ابھی تک گن موجود ہے۔ یہ سن کر ہجوم پیچھے ہٹ گیا۔ اب کار میں میرے ساتھ ایک مسلح پولیس اہل کار بھی تھا۔ اُس نے مجھے سمجھایا کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اتنی دیر میں رینجرز کے دو اہلکار بھی آ گئے۔ ان کے آنے سے ہجوم پر کافی اثر پڑا اور وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ان کے پاس ہتھیار بھی تھے۔ وہ مجھے بھیڑ میں سے نکالتے ہوئے آگے کی طرف لے کر جا رہے تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ کیسے آگے بڑھنا ہے۔

ایک نے مجھے مشورہ دیا۔ آہستہ چلو، ست مت نظر آؤ اور ہوشیار رہو۔ مجھے اس کا مشورہ اچھا لگا۔ اس نے مجھے تسلی دی کہ گھبراؤ نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھ پر اعتماد کرو۔ دو پولیس آفیسر میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے،۔ میں نے اپنا معاملہ قسمت پر چھوڑ دیا۔ ایک آفیسر نے اپنی گن کا رخ ہجوم کی طرف کر کے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔

ٹریفک کا وہ اہلکار جو پہلے میرے پاس آیا تھا۔ اس نے گاڑی کی کھڑکی سے مجھے کہا:

''میرا نام محمد ہے۔ میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ آپ ٹھیک سمت جا رہے ہیں۔ یہ ہجوم آپ کو مار ڈالنا چاہتا ہے۔''

میں نے کہا: ''ٹھیک ہے۔''

''آپ ہم پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ آپ اپنی گن ہمیں دے دیں۔ ہم آپ کی حفاظت کر رہے ہیں۔''

Scanned with CamScanner

''کیا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں! ہم پولیس ہیں۔ آپ اپنی گن ہمیں دے دیں۔''

''ٹھیک ہے، لیکن میں اسے باہر نہیں نکال رہا۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنی گن پر رکھ دیا۔ ''یہ یہاں ہے۔ نکال لیں۔''

محمد نے میری گن اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اس نے گن میں سے میگزین نکالا اور اسے اپنے سویٹر کی جیب میں رکھ لیا۔

اس کے بعد وہ باہر نکلا اور گن ہاتھ میں لے کر ٹہلتا ہوا جانے لگا۔ میں نے اسے پکارا۔

''محمد! کہاں جا رہے ہو؟''

میری بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے مجھے ''ٹریپ'' کیا تھا۔

ہجوم نے پھر میری کار پر مکے، ڈنڈے مارنے شروع کر دیئے۔ رینجرز کے جوان انہیں روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

دوسری طرف مجھے نکالنے کے لیے آنے والی ٹیم کی SUV گاڑی نے جب موٹر سائیکل کو ٹکر ماری تو انہیں رکنا پڑا۔ ٹیم نے موٹر سائیکل ہٹایا اور اسے عبادالرحمان کی لاش کے پاس پھینک دیا۔ اپنا راستہ بنایا اور مزنگ کی طرف بھاگے۔ اس وقت تک اس حادثے کو بھی بہت سے لوگوں نے دیکھ لیا تھا۔ اس طرح بے گناہ افراد کے ہمدردوں کی تعداد دوگنی ہوگئی تھی۔ جب وہ مزنگ پہنچے تو وہاں اور بہت سے لوگوں کا ہجوم تھا۔

اس موقع پر Z نے ریڈیو آن کیا اور بیس پر کال کی۔

''ہم نے وہ جگہ دیکھ لی ہے جہاں حادثہ ہوا۔ لیکن یہاں کہیں بھی ''رے'' یا اس کی گاڑی موجود نہیں ہے۔ ہمیں نہیں پتہ کہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟ ہجوم بہت بڑا ہے۔''

Scanned with CamScanner

Z اور ایگل نے میری تلاش میں علاقے کو کھنگالنا شروع کیا۔ ہجوم میں سے ایک آدمی نے SUV کا ڈرائیور والی سائیڈ کا دروازہ کھولا۔ ایگل نے فوری طور پر اپنا پسٹل نکالا اور اپنی طرف بڑھنے والے لوگوں کو روکنے کی کوشش کی۔

وہ چلایا: ''واپس جاؤ، واپس جاؤ۔''

ایگل کو دروازہ بند اور لاک کرنے کا موقع مل گیا۔

Z چلایا: ہم یہاں نہیں رک سکتے۔ یہاں بہت لوگ ہیں۔''

اتنی دیر میں وہاں پولیس پہنچ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پولیس انہیں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پولیس انچارج نے انہیں یہاں سے چلے جانے کو کہا۔ ٹیم نے گاڑی کو بیک کیا اور مین سڑک پر آ گئے۔ انہوں نے ہر راستے پر پولیس کو دیکھا لیکن انہیں قونصلیٹ تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

ابو حذیفہ

7
پرانی انارکلی پولیس اسٹیشن، لاہور

اسی دوران ٹریفک پولیس کا اہلکار محمد غائب ہو گیا۔ بندوق کو محفوظ جگہ رکھنے کے بعد اس نے دروازہ کھولا، گاڑی کی چابی نکالی اور مجھے دھکیلتے ہوئے پرانی انارکلی پولیس اسٹیشن پہنچا دیا۔ محمد اور رینجرز کے دو اہلکاروں نے مجھے ایک کمرے میں منتقل کیا اور پھر پولیس افسروں نے پنجابی، اردو اور انگلش کی مکس زبانوں میں مجھ سے سوال پوچھنے شروع کر دیئے۔ میرے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں اپنے RSO سے رابطے میں تھے اور وہ جیسا کہہ رہا تھا، میں ویسے ہی کر رہا تھا۔

میں نے اپنا بیج نکالا اور اُنہیں بتایا کہ میں امریکی قونصل خانے تک جانا چاہتا ہوں۔ پولیس افسر کا لہجہ بلند تھا لیکن اس کمرے کی صورت حال بہر حال اتنی تشویش ناک نہیں تھی۔

ایک آفیسر نے میرے بیجز کو پڑھا اور مجھ سے پوچھا کہ آپ امریکی ہیں؟

''ہاں!''

''کیا آپ کا تعلق امریکی سفارت خانے سے ہے؟''

میں جانتا تھا کہ یہ مشکل سوال ہے اور میرے لیے اس کا جواب دینا اور بھی مشکل تھا۔

''کس کے لیے کام کرتے ہو؟ کیا سفارت خانے کے لیے.....؟''

''قونصل جنرل.....یہ سفیر نہیں ہوتا۔''

Scanned with CamScanner

''کیا یہاں لاہور میں؟''

''ہاں!'' میں نے اپنے بیجز کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا کہ یہ پرانے بیجز ہیں۔

''کیا آپ لاہور میں کام کرتے ہیں؟''

''ہاں!'' ''کس حیثیت سے ,.....''

میں نے محسوس کیا کہ میرے لیے یہ بہترین موقع ہے کہ میں انہیں اپنے کام کی نوعیت کے بارے میں بتاؤں۔

''سکیورٹی کنٹریکٹر کی حیثیت سے...... لیکن میں کسی بھی قسم کی خفیہ کارروائیوں میں ملوث نہیں۔ میں صرف کنسلٹنٹ ہوں۔''

''کنسلٹنٹ.....؟''

''ہاں!''

''اور آپ کا نام کیا ہے؟''

''ریمنڈ ڈیوس.....''

''، تین افسروں نے باری باری میرا نام دوہرایا۔ باقی افسروں نے نہایت اونچی آواز میں گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ کمرے میں کافی شور تھا کیونکہ ایسا لگ رہا تھا کہ کمرہ سڑک پر ہے۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟''

''جی ضرور...... ایک آفیسر نے کہا اور پوچھا:

''پانی لیں گے؟''

میں کرسی پر بیٹھ گیا تو اس آفیسر نے کہا کہ نل کا پانی پینے سے بچیں، پاکستان آنے والے سیاح بھی یہ نہیں پیتے۔ کیا آپ کے پاس بوتل ہے؟

Scanned with CamScanner

بعد میں اس نے مذاق میں کہا کہ پیسے نہیں تو پانی بھی نہیں۔ وہ کنفیوز نظر آ رہا تھا۔ اس کی بات پر چند پولیس والوں نے زور کا قہقہہ لگایا۔

''کیا آپ کار میں سے میرا پاسپورٹ ڈھونڈ سکتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

انہوں نے میرا کام کر دیا اور ان میں سے ایک جب واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں میرا پاسپورٹ تھا۔ انہوں نے میرے بیگ میں سے تمام چیزیں نکال کر میز پر رکھ دیں اور مجھے دکھاتے ہوئے ایک ایک کر کے پوچھنے لگے۔

''کیا یہ تمہاری ہے؟''

''ہاں!''

''کیا یہ تمہاری ہے؟''

''ہاں!''

''کیا یہ تمہاری ہے؟''

''ہاں!''

بار بار ایک ہی سوال پوچھنے کے بعد ایک آفیسر نے میرا موبائل فون اٹھایا اور اسے میری شرٹ کی جیب میں ڈال دیا۔

''میرے ساتھ آؤ۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ یہ محفوظ جگہ نہیں ہے۔ تمہیں کسی محفوظ جگہ پہنچانا ہوگا۔''

اس آفیسر نے ایک کمبل میرے اوپر ڈالا اور مجھے لے کر بلڈنگ سے باہر آ گیا۔ یہ باہر کا علاقہ تھا اور یہاں لوگوں کا ہجوم میرے پیچھے نہیں آ سکتا تھا۔ آفیسر نے مجھے گاڑی میں بٹھایا اور پھر گاڑی سڑک پر دوڑنے لگی۔ مجھے یقین تھا کہ یہ مجھے فوجی علاقے کی طرف لے جا رہے ہیں جو ایئرپورٹ کے نزدیک تھا۔ یہاں RSO کو مجھے ڈھونڈنے میں مزید مشکل

Scanned with CamScanner

ہوگی۔

کمبل سامنے کرتے ہوئے، میں نے اپنا سیل فون شرٹ کی جیب سے نکالا اور آخری شخص جس سے میں نے بات کی تھی، اسے ٹیکسٹ میسج بھیجا کہ مجھے کینٹ لے جا رہے ہیں، RSO کو بتائیں۔ یہ شخص ہماری ٹیم کا ممبر تھا اور ہم اسے ''گوز'' کہتے تھے۔

میرا شک ٹھیک تھا۔ جیسے ہی گاڑی رکی۔ میرے سر سے کمبل ہٹا دیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ میں فوجی کیمپ میں ہوں۔ میں ٹھیک جگہ پر تھا۔ میں نے سوچا، لیکن اگر میں امریکی فوجی بیس کیمپ ہوتا تو مطمئن ہوتا لیکن یہ پاکستان کا فوجی کیمپ تھا۔ اس لئے فکر مندی کا احساس ہوا۔

پاکستان کے بارے میں، میں جانتا تھا کہ اگرچہ یہاں پارلیمانی نظام حکومت ہے۔ صدر ملک کا آئینی طور پر سربراہ اور وزیراعظم حکومتی سربراہ ہیں، لیکن اس کے باوجود اصل طاقت فوج کے پاس ہے۔

فوجی کیمپ خوبصورت لان اور پرشکوہ بلڈنگ کی بدولت مجھے ایک آئیڈیل جگہ لگ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سوچتا، مجھے دو گارڈز کی نگرانی میں اندر لے جایا گیا۔ اندر چند آفیسر میرا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں ایک انتہائی نوجوان آفیسر جو شائد لیفٹینٹ تھا، کمرے کے کونے میں موجود ایک بیڈ پر بیٹھا تھا۔ ایک دوسرا آفیسر اس کے پیچھے بیٹھا تھا۔ مجھے ان کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا گیا۔ میرے پیچھے آنے والے گارڈ نے میرا بیگ پیچھے کرسی پر رکھ دیا۔ اس نے میری جیب سے سیل فون نکالا اور اسے بھی سامنے میز پر رکھ دیا۔

میز کی دوسری طرف بیٹھے آفیسرز نے ایک ہمدردانہ سی مسکراہٹ پاس کی۔

''آپ کا آج کا دن مشکل دن تھا۔ وہ دونوں آدمی بہت برے تھے۔ ہم سمجھ سکتے

Scanned with CamScanner

تھی کہ آپ نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے یہ قدم اٹھایا۔ان کے پاس ہتھیار اور بارود تھا۔انہوں نے آپ کی تضحیک کی۔"ایک آفیسر نے کہا۔

"اب کچھ انتظامات کی ضرورت ہے۔" دوسرا بولا۔

"آپ بہت اچھے شوٹر ہیں اور بہت تربیت یافتہ بھی ہیں۔"

"آپ کتنی بار گولیاں مارتے ہیں؟"

"سال میں ایک مرتبہ"

انہوں نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا۔شاید انہیں میری بات سمجھ نہیں آئی تھی۔

"ٹریننگ کے دوران ایک دفعہ گولیاں چلاتے ہیں۔"

"میں نے تمھاری گولیوں کے نشان دیکھے ہیں۔تم بہت اچھے شوٹر ہو۔کیا ہم تمہیں اپنی پولیس کو ٹریننگ کو دینے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں؟"

"میں نہیں جانتا تھا کہ وہ صحیح بات کر رہا ہے یا مذاق کر رہا تھا۔"

وہ کھڑا ہو کر فون پر بات کرنے لگا۔فون پر اس نے "او کے" کہا اور مجھ سے پوچھا کہ بتایئے کہ کیا ہوا تھا؟"

میں نے اپنا حلق صاف کیا۔"میں جیل روڈ اور فیروز زور روڈ کے چوک پر تھا۔میں نے دیکھا جب ٹریفک میں اور....

پھر اس کے فون آنے لگے اور بات رک گئی۔جب اس کے فون کی تعداد بڑھ گئی تو ایک اور افسر نے اسے کہا کہ جاؤ۔پھر مجھے کہا کہ "مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

"تم کہاں سے آرہے تھے؟"

میں انہیں حفاظتی نقطہ نظر سے اپنی ٹیم کی رہائش کے بارے میں بتانا نہیں چاہتا تھا۔

"میں قونصل خانہ سے آرہا تھا۔"

Scanned with CamScanner

"آپ کہاں جا رہے تھے؟ اور ڈرائیونگ کے دوران آپ کے ارد گرد کون لوگ تھے؟"

میں پرانے لاہور میں Cuckoo's Nest ریسٹورنٹ جا رہا تھا۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا ہے کہ وہاں کا کھانا اچھا ہے۔"

اس اثنا میں بیڈ پر بیٹھا نوجوان لیفٹیننٹ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے میرے ارد گرد چکر لگانے شروع کر دیئے۔

"Cuckoo's Nest کے بارے میں آپ اور کیا جانتے ہیں؟' اس نے پوچھا۔

اس کی انگلش بہترین تھی اور وہ ان تمام آفیسرز میں سب سے ذہین بھی لگ رہا تھا۔

"Cuckoo's Nest، ہاہاہا.....اس مقام کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟"

"میں یہی جانتا ہوں کہ وہ کھانے کا ایک اچھا مقام ہے۔ میں نے ایک گائیڈ بک میں پڑھا تھا۔"

"اور اس کے علاوہ کچھ......"

اس کے بعد پھر فون کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہر آفیسر نے مجھ سے ایک ہی سوال کیا اور بار بار کیا۔ میں بھی دوبارہ سے ان کے جواب دیتا گیا۔ پھر انہیں کوئی فون کرتا اور ان سے اس حادثے کے بارے میں پوچھتا۔ میں اس سے ڈسٹرب تو ہو رہا تھا لیکن یہ سب کچھ میرے فائدے کے لیے ہو رہا تھا۔ مجھے اس طرح کی صورتحال سے نمٹنے کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ میں ان کے سوالوں کے جواب وقفے وقفے سے اور دیر سے دینا چاہتا تھا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح میرے RSO کو پتہ چل جائے کہ میں کہاں ہوں؟ اور وہ مجھ تک پہنچ

Scanned with CamScanner

جائے۔ میرے اس اقدام سے RSO کو مجھ تک پہنچنے کے لیے مزید ٹائم مل سکتا تھا۔ اس لیے میں اس ساری صورتحال سے خوش بھی تھا۔ اب میں پھر کہانی کی طرف آتا ہوں۔

اس پوری تفتیش کے دوران جن افسران نے مجھ سے تحقیقات کیں، ان میں کسی نے بھی ان دو لوگوں کی ہلاکت کی اصل تفصیلات یا دو مریضوں کی شناخت کے بارے میں کوئی پرواہ نہیں کی اور نہ ہی کچھ پوچھا۔ وہ تو صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا میں وہی ہوں جو میں تھا اور میں لاہور میں کیا کر رہا ہوں؟

میں انہیں اپنی ٹیم اور رہائش کے بارے میں کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔ نہ ہی اس معاملے میں کسی اور کو لانا چاہتا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا، وہ میں نے کیا تھا اور میں ہی اس کا ذمہ دار تھا اور میں نے یہ سب کچھ اپنے دفاع میں کیا تھا۔

کئی گھنٹوں کی تفتیش اور سوالوں کے بعد بھی کچھ کلیئر نہیں تھا۔ تفتیش میں پے در پے آنے والی فون کالز نے رخنہ ڈالا تھا۔

جب میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو میں نے پارٹ ٹائم ایک پرائیویٹ جاسوس کے طور پر بھی کام کیا تھا۔ اس دوران میں نے جاسوسی پر بہت سی کلاسیکی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا۔ میں نے نتیجہ یہ نکالا تھا کہ نرمی سے گفتگو کسی بھی آدمی کو توڑ سکتی ہے لیکن یہ کلیہ ہر جگہ کامیاب نہیں ہوتا۔ جو آفیسر مجھ سے تفتیش کر رہے تھے، وہ صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ اس کے علاوہ انہیں کوئی مطلب نہیں تھا۔

مجھے اس وقت ایک خوشگوار حیرت کا سامنا ہوا جب میں نے ان سے پوچھا کہ ”کیا میں اپنا فون استعمال کر سکتا ہوں؟“

انہوں نے خوشی سے اجازت دے دی۔

میں نے Goose کو فون ملایا۔ ”کیا میرا میسج مل گیا تھا؟“

Scanned with CamScanner

"ہاں! میں نے RSO کو بتا دیا ہے کہ آپ کینٹ کے علاقے میں ہیں۔ ہم پہنچ رہے ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔"

"شکر ہے خدا کا....."

"کیا آپ نے پنے GPS تک رسائی حاصل کی ہے؟"

میں نے اپنے کندھوں پر اپنے بیگ کو دیکھا جو میرے پیچھے کرسی پر رکھا تھا۔ اس GPS کے ڈیٹا کو ڈیلیٹ کرنا ضروری تھا، کیونکہ اس میں وہ معلومات بھی تھیں کہ ہم نے تین دن بعد ان راستوں سے کسے لے کر جانا ہے۔

اگر یہ افسران ان معلومات کو حاصل کر لیتے تو اسے میرا مشن سمجھتے۔ اس کے علاوہ GPS میں بہت سی چھوٹی چھوٹی معلومات بھی شامل تھیں جیسے کہ قونصل خانہ کے بارے میں.... پھر پاکستان کی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی GPS کو مانیٹر کرتی ہوگی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی طرح کی معلومات آئی ایس آئی کے پاس جائیں۔ Goose نے مجھے یہ کہا تھا کہ GPS سے تمام معلامات ڈیلیٹ کر دوں۔

میں نے افسر سے پوچھا کہ کیا میں اپنے بیگ سے رکھا ہوا ایک ڈبا نکال سکتا ہوں؟ اُس نے بے یقینی کے عالم میں میری طرف دیکھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اس میں چبانے والا تمباکو ہے۔ وہ ابھی بھی نہیں سمجھ پایا تھا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ نسوار ہے۔ اُس نے مجھے اجازت دے دی۔۔ نسوار ایک طرح کا نشہ ہے جو تمباکو کی جگہ پختون صوبے کے پٹھان استعمال کرتے ہیں۔ غیر ملکیوں کے لیے اس میں کافی کشش پائی جاتی ہے۔

میں اپنے بیگ کی طرف گیا۔ ان سب کی نظریں مجھ پر تھیں۔ مجھے ان سب کو دھوکہ دینا تھا اور اپنا کام بھی کرنا تھا۔ میں نے جھک کر بیگ میں ہاتھ ڈالا اور اپنے جسم کو اس

Scanned with CamScanner

پوزیشن میں کرلیا کہ اُسے نظر نہ آئے کہ میں کیا کررہا ہوں۔ میں بظاہر یہ دکھا رہا تھا کہ میں کچھ تلاش کررہا ہوں۔ میں نے بیگ کھول کر ادھر اُدھر ہاتھ مارتے ہوئے GPS کو تلاش کرنا شروع کیا۔ GOOSE کی ہدایات کے مطابق GPS سے تمام ڈیٹا ڈیلیٹ کرنے کے لیے پہلے اسے آن کرنا ضروری تھا۔ تب ہی ڈیٹا ڈیلیٹ ہوسکتا تھا۔ میں نے اپنی کمر ان کی طرف کرکے GPS آن کیا اور جب سکرین پر یہ لکھا ہوا نمودار ہوا کہ کیا آپ اپنا ڈیٹا ڈیلیٹ کرنا چاہتے ہیں؟ تو میں فوری طور پر یس کا بٹن پریس کردیا۔

اس اثنا میں وہی نوجوان لیفٹیننٹ میرے پاس آیا اور GPS مجھ سے چھین کر دوسرے افسروں کو دکھانے لگا۔ انہیں سمجھ آگئی تھی کہ میں نے کیا کیا ہے۔ تمام کمرے میں شور مچ گیا۔

اچانک ایک افسر کمرے میں داخل ہوا جسے دیکھ کر سب ایسے الرٹ ہوگئے جیسے بچے کلاس روم میں ٹیچر کے آنے سے ہوجاتے ہیں۔

نیا آنے والا آفیسر میز کے دوسری طرف میرے سامنے آکر بیٹھ گیا اور سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے فون پر کسی سے بات کرنے لگا۔

اس آفیسر کے آنے کے بعد کمرے کا ماحول بدل گیا تھا۔ مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ کون ہے؟ اور کون سی تنظیم سے اس کا تعلق ہے۔ آئی ایس آئی کی اس کیس میں دلچسپی کا مطلب تھا کہ کیس پیچیدہ ہوگیا ہے۔

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

8

امریکی سفارت خانہ، اسلام آباد

(27 جنوری، پہلا دن)

ابو حذیفہ

کیمرون منٹر اُس وقت پاکستان میں امریکی سفیر تھے جس وقت یہ حادثہ ہوا۔ وہ کیریئر ڈپلومیٹ تھے اور وہ آئی ایس آئی کے ساتھ مل کر اس مسئلے کو حل کرنے کی اہمیت کو سمجھتے تھے جس سے میں دوچار تھا۔ پاکستان میں تعیناتی سے قبل وہ چیک جمہوریہ، پولینڈ، عراق اور سربیا میں خدمات انجام دے چکے تھے۔

کیمرون منٹر اس واقعے سے اس وقت آگاہ ہوئے جب انہوں نے ایک پاکستانی نیوز چینل پر اس بارے میں نیوز دیکھی۔ سب سے پہلے ان کے پاس اس واقعے کے بارے میں جوابات سے زیادہ سوالات تھے۔ لیکن دو باتیں ان کے ذہن میں بڑی کلیئر تھیں۔ پہلی یہ کہ ٹیلی ویژن میں لوگ کہہ رہے تھے کہ جس شخص کو میں نے مارا، وہ پیچھے کو لوگوں کو لوٹ کر آیا تھا اور عادی چور تھا جو غلط موقع پر غلط آدمی کے ہتھے چڑھ گیا۔ دوسری بات جو ان کے نزدیک سب سے اہم تھی، یہ تھی کہ کیا میری سفارتی حیثیت ہے؟

ایک چیز اس وقت تک واضح ہو چکی تھی کہ میرے پاس سفارتی پاسپورٹ تھا۔ منٹر نے اپنی پاکستانی سفارتی ٹیم سے میٹنگ میں یہ تجویز کیا کہ اس مسئلے پر پاکستانی حکام سے بات چیت کی جائے۔ منٹر سمجھتا تھا کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ مجھے سفارتی

Scanned with CamScanner

حیثیت حاصل ہے یا نہیں بلکہ میں سفارت خانے سے ہی وابستہ تھا اور میرا کام سفارت کاروں کی حفاظت کرنا تھا۔اس لیے مجھے سفارتی طور پر محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔

منٹر نے اجلاس میں کہا کہ ہمیں پاکستانی حکام کے پاس جانا چاہیے اور انہیں کہنا چاہیے کہ یہ ہمارا آدمی ہے اور اسے فوری رہا کیا جائے۔

اس طرح پاکستان میں امریکی سفارت خانہ آئی ایس آئی کے خلاف نہیں تھا۔ایک ایسی ٹیم جس کے بہت سے حصوں نے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کیا،ایک ہی مقصد کی طرف کام کر رہے تھے۔یہ وہ دور تھا جب صدر اوبامہ کی حمایت کے ساتھ، امریکی حکومت نے پاکستان میں اپنے اثر ورسوخ اور موجودگی میں اضافہ کرنا شروع کر دیا۔اس کی وجہ پاکستان کے ساتھ بہتر شراکت داری، امریکی امدادی کارکنوں کی آمد اور 2010 سے 2014 تک پاکستان کو 1.5 بلین ڈالر سالانہ امداد دینے کا وعدہ تھا۔اسی وجہ سے اسلام آباد کا امریکی سفارت خانہ دنیا میں امریکہ کا سب سے بڑا سفارت خانہ بن گیا تھا جہاں ڈھائی ہزار ملازمین کام کر رہے تھے۔بہت سے نئے ملازمین روز بروز پہنچ رہے تھے۔جب منٹر اکتوبر 2010 میں اسلام آباد پہنچے تو بہت سے سٹاف ممبران ہال کی میزوں پر کام کر رہے تھے۔

اس طرح کے غیر معمولی ماحول میں یہ غلطی ناگزیر تھی۔منٹر نے 2015 کے ایک انٹرویو میں اعتراف کیا:

''سفارت خانے کے لوگوں کو سفارتی حیثیت رکھنے والی لسٹ کو اپ ڈیٹ رکھنے کی ضرورت تھی۔ہم نے کچھ چیزوں کو نظر انداز کیا۔ہم وہاں مناسب کاغذی کارروائی نہیں کر سکے۔ہم اپنا ریکارڈ بھی محفوظ نہیں رکھ سکے اور ہم تعلقات وسیع کرنے کے نازک دور میں پکڑے گئے۔''

Scanned with CamScanner

میرا نام ایک پرچی پر لکھ کر ریکارڈ میں شامل کیا گیا۔ یہ بڑی غلطی تھی۔ اس میں ایسے بہت سے لوگوں کے نام نہیں تھے جنہیں پاکستان میں سفارتی حیثیت اور استثنیٰ حاصل تھا۔ پاکستان کو دی جانے والی سفارتی استثنیٰ رکھنے والی شخصیات میں میرا نام شامل نہیں تھا۔ یہ چھوٹی سے کلریکل غلطی تھی لیکن اس موقع پر یہ بہت بڑی غلطی بن گئی جس کے انتہائی سنگین نتائج برآمد ہوئے۔

Scanned with CamScanner

ابو حذیفہ

9

لاہور کنٹونمنٹ، لاہور

پہلے دن مجھے جس فوجی علاقے کے کمرے میں رکھا گیا تھا، وہ کمرہ اس آفیسر کے آنے کے بعد اور چھوٹا ہو گیا تھا جو سگریٹ کے دھوئیں کے کش اڑاتا ہوا کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ وہ وہاں تک آیا جہاں میں بیٹھا ہوا تھا۔ لیکن اس نے میری طرف نہیں دیکھا اور مجھے بالکل نظر انداز کیا۔ وہ تمام وقت فون پر بات کرتے ہوئے سگریٹ پھونکتا رہا۔

یہ "پاور پلے" چل رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھے کسی بھی شخص نے اس کے سامنے ایک لفظ تک نہیں بولا۔ پھر اس نے اپنا فون بند کیا، سگریٹ بجھائی۔ کافی دیر کے بعد اس نے مجھے نظروں میں جانچا کہ میں کتنے پانی میں ہوں۔

"مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

"میں اس وقت تک بات نہیں کروں گا جب تک میں یہ نہ جان جاؤں کہ میں کس سے بات کر رہا ہوں۔ براہ مہربانی! بتایئے، آپ کون ہیں؟"

"میں کرنل ہوں۔"

چونکہ میں فوجی علاقے میں تھا۔ اس لیے میں نے سمجھا کہ یہ ملٹری پولیس کا کرنل ہے کیونکہ اس نے میرے سوال کا مکمل جواب نہیں دیا تھا۔

اس نے دوبارہ کہا: "میں کرنل ہوں۔"

Scanned with CamScanner

میرے پاس اس شخص کی شناخت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ آئی ایس آئی کے لئے کام کرتا تھا۔

کرنل نے ایک اور سگریٹ جلایا اور مجھ سے کہا:

''مجھے سنانے کے لیے آپ کے پاس ایک کہانی ہوگی۔ براہ مہربانی میرے ساتھ شیئر کریں۔''

میں نے اس سے کہا کہ ''مزنگ چوک میں جو کچھ ہوا، دوسرے افسران اس کے بارے میں کیا بتاتے ہیں؟

وہ کسی رکاوٹ کے بغیر مجھ سے تمام واقعات کی کہانی سننا چاہتا تھے۔ میں نے مختصر لفظوں میں سب کچھ بتادیا۔ جب میں آخر میں پہنچا تو اس نے اچانک سوال پوچھا:

''تم کہاں کام کرتے ہو؟''

''امریکی قونصل خانے میں!''

''کون سے دفتر میں؟''

میں نے جواب دیا: RAO، علاقائی امور کے دفتر میں!''

''میں سمجھ گیا۔ اچھا ٹھیک ہے، RSO کون ہے؟

''بل وومیک'' میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

کرنل نے ایک آنکھ اوپر اٹھائی۔ ''وہ ابھی چھوڑ گیا ہے۔ نیا RSO کون ہے؟''

جب بھی کسی ملک میں، میں نئے معاہدے کے تحت جاتا تھا تو عام طور پر براہ راست سفارت خانے یا قونصل خانہ میں ہر کسی سے مل لیتا تھا۔ اس سفر پر میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ میں جیسے ہی لاہور پہنچا، میں نے کام شروع کر دیا اور میں چھ دن سے قونصل خانے نہیں گیا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ بل وومیک چلا گیا ہے لیکن نیا RSO کون تھا؟ مجھے اس کا نام

Scanned with CamScanner

نہیں پتہ تھا۔

کرنل کو یہاں مجھ پر نفسیاتی غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ کرنل نے اس کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

"آپ کے بعد کون آدمی آئے تھے؟"

"میں کسی کو نہیں جانتا جو میرے بعد آیا تھا۔"

"لیکن تم اپنے ریڈیو پر کسی سے بات کر رہے تھے۔"

"نہیں، جب میں ریڈیو استعمال کر رہا تھا تو اپنے قونصلیٹ بات کر رہا تھا کہ کیا ہوا ہے۔"

"اس کے بعد کچھ لوگ آئے تھے، تم انہیں جانتے ہو۔ کون تھے وہ لوگ.....؟"

"میں نہیں جانتا، آپ کس کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے موٹر سائیکل کو کیسے ہٹ کیا؟"

"کیا..... میں نے موٹر سائیکل کو ہٹ کیا۔"

"ہاں! جب تم نے موٹر سائیکل کو ہٹ کیا؟"

"میں نے موٹر سائیکل کو ہٹ نہیں کیا؟"

میں جان گیا تھا کہ کرنل تحقیقات کے روایتی طریقے استعمال کر رہا ہے۔ کرنل مجھے کنفیوز کر کے ٹریپ کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے اقرار کروانا چاہتا تھا کہ میں نے موٹر سائیکل کو ٹکر ماری۔ پھر اس نے کمرے میں موجود ایک آفیسر سے اردو میں گفتگو کی۔

پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا:

"یہ بات واضح ہو چکی کہ موٹر سائیکل کو ٹکر آپ کے ساتھیوں نے ماری تھی اور اس نوجوان کو ہلاک کیا تھا۔"

Scanned with CamScanner

کرنل نے مجھے سگریٹ کی پیش کش کی اور کہا:

"لیکن آپ دوسرے واقعے کے ذمہ دار ہیں۔"

اس موقع پر میں نے سوچا کہ پولیس اس واقعہ کی تحقیق کرنے کے لئے اپنی پوری کوشش کر رہی ہو گی لیکن کرنل نے جو کچھ کہا تھا اس کے بعد، میں نے کسی بھی ہمدردی کے جذبات کو کھو دیا تھا۔ اس کے الفاظ چہرے پر ایک پردہ کی طرح تھے۔ میں نے اچانک محسوس کیا کہ آئی ایس آئی مجھ پر دباؤ ڈال رہی ہے اور مجھ میں انہیں روکنے کی بہت کم ہمت تھی۔ میں نے کرنل کو ناقابل یقین حد تک دیکھا۔

"آپ کو پتہ ہے؟ میں یہاں بات کر رہا ہوں، لیکن آپ کے لفظ مجھ سے بات کرتے ہوئے نہیں مل رہے۔"

کرنل نے مجھے یہ کہا اور تفتیش ختم کر دی۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کتنی دیر تک میری گھڑی اور فون ضبط رکھا گیا۔ پھر ایک جوان لیفٹیننٹ نے مجھے کاغذ کی ایک شیٹ اور ایک قلم دیا اور کہا کہ اس دن جو کچھ ہوا تھا، وہ سب کچھ اس کاغذ پر لکھ دوں۔

میں ایسا کرنے کے لئے خوش تھا۔ میں نے اپنے بیان پر کئی گھنٹوں تک کام کیا کیونکہ میں اس بات کو یقینی بنانا چاہتا تھا کہ میں جو لکھوں، صحیح لکھوں، کیونکہ میں بے گناہ تھا اور حق پر تھا۔

گارڈز میرے کمرے میں کئی بار آئے اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نے بیان مکمل کر لیا ہے۔ مگر میں نے انہیں جلدی بیان دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اپنا وقت لیا، اپنی کہانی کے ہر ایک لفظ کو شامل کر کے یاد رکھنا، بالکل اسی طرح جس نے پہلے ان سے کہا تھا، خاصا مشکل ہے۔ صرف ایک معلومات میں نے ان سے چھپائی کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور

Scanned with CamScanner

کہاں جارہا تھا، لیکن، ظاہر ہے، افسران اسی بات میں سب سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ میرے بیان کو دیکھنے کے بعد انہوں نے مجھ پر سوالات کی بمباری کردی۔

"کہاں جارہے تھے؟ وہ لوگ جو SUV میں آپ کے بعد آئے تھے، کون تھے؟"

"میں پہلے ہی آپ کو بتا چکا ہوں۔ جو کچھ میں جانتا ہوں، وہ اس بیان میں موجود ہے اور میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا۔" میں نے صاف سا جواب دیا۔

انہوں نے کئی بار مجھ سے سوال پوچھنے کی کوشش کی۔ وہ مجھ سے کچھ اور اگلوانا چاہتے تھے۔ پھر مجھے اس کمرے میں لے جایا گیا جہاں وہ مجھے رات ٹھہرانا چاہتے تھے۔ کافی وقت ہو چکا تھا۔ اس دن کے تمام ڈرامے کا میں عینی شاہد تھا۔ اس کمرے کا ماحول آرام دہ نہیں تھا۔ پچھلے کمرے میں ایک ٹیلی ویژن موجود تھا جہاں میں نے دیکھا تھا کہ ٹی وی چینلز اس واقعے کی کوریج کر رہے ہیں۔ پہلی نیوز سٹوری کے علاوہ دوسری اور تیسری سٹوری بھی اسی واقعے سے متعلق تھی۔ میں نے ناراض مظاہرین کو فائرنگ کی جگہ پر ٹائر جلاتے ہوئے دیکھا۔ میں پاکستانی ذرائع ابلاغ کی طرف سے اور مبصرین کے تجزیوں سے یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ فیصلہ میرے حق میں نہیں تھا۔ مجھے بے حد مدد کی ضرورت ہے، لیکن اس معاملے کے لئے قونصل خانے سے RSO یا کوئی اور ابھی تک میرے پاس نہیں پہنچا تھا۔

میرے ڈپریشن مین اضافہ ہو چکا تھا۔ کمرے میں چار محافظ میرے ساتھ تھے۔ ان میں سے دو دروازے کے دونوں طرف کرسیوں پر بیٹھتے تھے اور دو کمرے کے دوسری طرف بستر پر بیٹھے تھے۔ میں ان کی مخالف سمت میں بستر پر بیٹھا تھا۔ میں نے کمبل کو اپنے اوپر کیا لیکن چہرہ باہر رکھ کر انہیں دیکھتا رہا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ وہ ہیرو بننے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ ٹیلی ویژرن کی کوریج سے مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ پاکستان میں لوگ اس واقعے کی بابت پریشان ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ محافظ مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش

Scanned with CamScanner

کریں تو میں کیا کر سکتا ہوں؟

دو گارڈز ایک دوسرے سے اس واقعے کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ناراض ہیں۔ ایک گارڈ کا ہاتھ مسلسل اپنے پسٹل پر تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ایک اور پولیس اسٹیشن میں قید ہو گیا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے مارنے کی منصوبہ بندی کر رہے ہوں.... میں کسی پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

ابو حذیفہ

10

لاہور کنٹونمنٹ، لاہور

(28 جنوری، دوسرا دن)

پہلی رات میں بمشکل 15 منٹ سو سکا، مجھے تشویش اپنے تحفظ کی تھی کیونکہ جو گارڈ میری نگرانی پر مامور تھا، اس نے اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ جیسے ہی صبح ہوئی، میں نے سکون کا سانس لیا۔گارڈ نے مجھے عدالت میں پیشی کیلئے اٹھایا اور کہا کہ میں میکڈونلڈ جا رہا ہوں۔ کیا ناشتہ کرنا چاہو گے۔ مجھے یاد آیا کہ گذشتہ روز سے اب تک میں کچھ نہیں کھایا تھا۔ ناشتے کے بعد میں اسی کمرے میں آ کر بیٹھ گیا جہاں میں اپنی آمد کے وقت بیٹھا تھا۔ وہی نوجوان لیفٹیننٹ وہاں موجود تھا جو مجھے سب سے زیادہ ذہین لگا تھا اور جس نے میرے ہاتھ سے جی پی ایس چھینا تھا۔ میں نے مقامی نیوز چینلز پر اپنے واقعے اور اپنے خلاف عوامی احتجاج کی فوٹیجز دیکھیں، جن میں عوامی حلقے مجھے سزائے موت دینے کا مطالبہ کرر ہے تھے۔ میں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی گاڑی کو دیکھا۔ ان موٹر سائیکلوں کو دیکھا جن کے سواروں کو میں نے گولیاں ماری تھیں۔ نیوز کاسٹر چونکہ اردو میں یہ سب کچھ بتا رہی تھی اس لیے مجھے کچھ سمجھ نہ آیا۔ میری نگرانی پر مامور اسی لیفٹیننٹ نے بتایا:

''جن 2 نوجوانوں کو میں نے گولی ماری تھی، وہ ہلاک ہو گئے ہیں۔ نوجوان لیفٹیننٹ

Scanned with CamScanner

نے میرے ردعمل کا جائزہ لیا کہ میں کیا کہتا ہوں، لیکن میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

ایک نوجوان کی بیوی نے رات کو زہر کھا کر خودکشی کر لی ہے، ان تمام اموات کے ذمہ دار تم ہو۔"

اس بات نے میری توجہ اس کی جانب کر دی۔ اس حادثے کی نذر ایک اور زندگی ہو گئی لیکن میں خاموش رہا۔

میرا خیال تھا کہ وہ لیفٹیننٹ صرف میرا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خود کو پر اعتماد ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

پاکستان کوڈ آف کریمنل پروسیجر کے مطابق کسی بھی ملزم کو جرم کے وقوع پذیر ہونے کے 24 گھنٹے کے اندر مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے۔ مجھے ہتھکڑی میں عدالت پیش کیا گیا، عدالت لوگوں سے بھری تھی جس میں واحد امریکی میں تھا اور میری جانب سے پیروی کرنے والا کوئی نہیں تھا حتیٰ کہ امریکی قونصلیٹ کا بھی کوئی نمائندہ موجود نہیں تھا۔ مجھے امریکی RSO کے نہ ہونے سے خاصی مایوسی ہوئی تھی۔ پراسیکیوٹر اسد منظور بٹ میری مدد کر رہا تھا لیکن میری پیروی کے لیے کوئی اور عدالت میں موجود نہ تھا۔ قونصل خانے کے بغیر کسی قانونی نمائندگی یا مدد کے بغیر پاکستان میں مقدمے کی سماعت کے بارے میں سوچنے کے خیال سے ہی مجھے پیٹ میں درد محسوس ہوا۔ شائد امریکی حکومت کا خیال تھا کہ میں آزادانہ نوکری کر رہا ہوں اور پرائیویٹ کنٹریکٹر کے طور پر اپنے معاملات میں آزاد اور خود مختار ہوں۔

چند ابتدائی کلمات کے بعد پراسیکیوٹر مجھ تک پہنچ گیا اور اس نے میرا بیان پیش کیا اور مجھ سے انگلش میں پوچھا:

"آپ کے بیان کے مطابق آپ نے جیل روڈ پر دو لوگوں کو نہیں مارا۔ کیا یہ ٹھیک

Scanned with CamScanner

"ہے؟"

"یہ ٹھیک ہے۔"

"آپ کس طرح اپنا کیس لڑنا چاہتے ہیں؟"

میں نے اپنے کندھوں کی طرف دیکھا اور اور امید کی کہ ابھی قونصلیٹ کا کوئی آدمی کھڑا ہوگا لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔

میں نے کہا: "میں قصوروار نہیں ہوں۔ میں اپنی حفاظت کے لیے ایسا کیا۔"

جج کے کہنے پر ڈی ایس پی کاظمی نے مزنگ چونگی واقعہ کا حال بیان کیا جو میرے پولیس کو دیئے گئے بیان کے عین مطابق تھا۔ کاظمی نے کہا کہ مسٹر ڈیوس کی کار کے پیچھے موٹر سائیکل سواروں نے اسے گن دکھائی جس پر ڈیوس نے اپنی حفاظت کے لیے موٹر سائیکل سوار کو گولی ماری۔ ڈی ایس پی کاظمی کے بیان سے مجھے حوصلہ ہوا کہ پولیس حقائق تک پہنچنے کی کوشش میں ہے۔

پراسیکیوٹر بٹ صاحب نے مجھ سے پوچھا:

"کیا میں کوئی اور زبان جانتا ہوں؟ کیا میں اُردو جانتا ہوں؟"

"نہیں، نہیں، میں نہیں جانتا۔"

"لیکن میرا خیال ہے تم اردو جانتے ہو۔"

میں اُردو کے صرف چند الفاظ جانتا تھا۔ پراسیکیوٹر یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں ایک جاسوس ہوں اور اُردو اچھی طرح سے جانتا ہوں، کیونکہ جاسوس اکثر مقامی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ اس لئے پراسیکیوٹر نے جج کے ساتھ اُردو میں گفتگو شروع کر دی جس پر میں نے اعتراض کرتے ہوئے جج سے کہا:

"میں معذرت خواہ ہو سر!! میں صرف انگلش جانتا ہوں اور عدالتی کارروائی سمجھنے سے

Scanned with CamScanner

قاصر ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

پراسیکیوٹر اس بات کا فائدہ اٹھا رہا تھا کہ میری کوئی پیروی نہیں کر رہا۔ بعدازاں مجھے معلوم ہوا کہ جن لڑکوں کو میں نے گولی ماری تھی، وہ پولیس ریکارڈ یافتہ اور پچاس مرتبہ گرفتار ہو چکے تھے۔ اس واقعہ کے بعد ان کے قبضے سے چوری شدہ موبائل اور غیر لائسنسی اسلحہ برآمد ہوا۔ اس کے باوجود پراسیکیوٹر نے مجھے عدالت میں مجرم ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی اور کہا کہ میں نے حیدر کو بھاگتے ہوئے گولی ماری ہے۔ پراسیکیوٹر کا کہنا تھا کہ یہ ایک ثابت شدہ کیس ہے لیکن جج نے مجھے چودہ دن کے جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیجنے کے احکامات دے دیئے۔

یہ پاکستان میں عدالتی انصاف کا ایک نمونہ تھا۔

عدالت کے باہر ایک گاڑی میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے اس میں بٹھا دیا گیا۔ مجھے نہیں پتہ کہ اب کہاں جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ تھوڑی دیر کی ڈرائیونگ کے بعد پولیس کینال روڈ پر واقع لاہور پولیس ٹریننگ کالج کی عمارت میں پہنچ گئی جہاں درجنوں کلاشنکوف بردار اہلکار حفاظت پر مامور تھے اور سب AK47 رائفلوں سے مسلح تھے۔

وہاں مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں رکھا گیا۔ کئی گھنٹے بعد ایک اہلکار نے مجھے مخاطب کر کے "انٹرویو" کا لفظ بولا۔ مجھے لگا کہ پولیس مزید تفتیش کرنا چاہتی ہے، اہلکار مجھے ایک بڑے کمرے میں لے گیا، جہاں مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ قونصلیٹ جنرل لاہور کی ٹیم مجھ سے ملنے کیلئے آئی ہوئی تھی۔ اس ٹیم میں قونصل جنرل کارمیلا کونرائے بھی شامل تھی، جو پورے قونصلیٹ کی انچارج تھیں۔ وہ صرف اسلام آباد میں سفیر کیمرون منٹر کو جواب دہ تھیں۔ ان سے میری پہلے بھی کئی مرتبہ ملاقات ہو چکی تھی اور میں نے ان کے گھر پر کئی تقریبات میں بھی شرکت کی تھی۔ ان کے گھر کی کرسمس پارٹیز بڑی مشہور تھیں۔ ایک بار

Scanned with CamScanner

انہوں نے میری ٹیم کو اپنے گھر فلم دیکھنے کے لیے بھی مدعو کیا تھا۔ وہ کیریئرڈپلومیٹ تھیں اور لاہور سے پہلے افغانستان میں مہاجرین کی ریجنل کوآرڈینیٹر تھیں۔ اس کے علاوہ وہ جاپان میں بھی تعینات رہیں۔ میں کارمیلا کے آنے سے کافی پرسکون ہو گیا۔

جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا۔ وہ میز کے دوسری طرف اٹھ کھڑی ہوئیں۔ مجھ سے ہاتھ ملایا اور میرا جائزہ لینے لگیں۔

"کیسے ہو؟ رے!"

"میں ٹھیک ہوں۔"

کارمیلا کے پیچھے کھڑا ہوا آدمی آگے بڑھا اور ہاتھ ملاتے ہوئے کہا:

"میں ڈیل رش، سفارت خانے میں ریجنل میڈیکل آفیسر ہوں۔"

"میں 18 ڈیلٹا ہوں۔" میں نے اسے بتایا۔ 18 ڈیلٹا سپیشل فورس میں میڈیکل سرجن کا کوڈ تھا۔

ڈیل نے کوڈ متعارف کروانے پر شکریہ ادا کیا اور بولا: "میں بھی سپیشل فورس کے میڈیکل سے وابستہ ہوں۔ اس لیے میں بھی 18 ڈیلٹا ہوں۔"

ڈیل نے میرا مکمل طبی معائنہ کیا۔ "کیا محسوس کر رہے ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں۔"

لیکن اس نے مجھے اور قریب آ کر دیکھا۔ "کیا تم اپنی شرٹ اتار سکتے ہو؟"

"کیوں نہیں ...." وہ جاننا چاہتا تھا کہ کہیں مجھ پر تشدد تو نہیں ہوا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں بڑے آرام سے رہا ہوں۔

"لیکن مجھے پوری تسلی کرنی اور تمہارا معائنہ کرنا ہے۔ کیا تم اپنی پینٹ اتار سکتے ہو؟"

"مجھے کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔" میں نے پھر بتایا۔

Scanned with CamScanner

کارمیلا یہ بات سن کر ایکسکیوزمی کہتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

میں نے پینٹ اتاری۔ڈیل نے معائنہ کیا اور اطمینان کا اظہار کیا۔

''میں نے معائنہ کرلیا ہے۔سب ٹھیک ہے۔''

ڈیل نے کارمیلا سے کہا کہ وہ واپس آسکتی ہے۔کارمیلا نے اپنی کرسی سنبھالی اور کہا کہ میری بیوی اور بیٹا فکرمند ہیں۔

کارمیلا نے مجھے ایک پیڈ اور پین دیتے ہوئے کہا کہ اگر اپنی فیملی کے نام کوئی پیغام دینا ہے تو اس پر لکھ دوں۔

میرے لئے تکلیف دہ امر یہ تھا کہ قونصلیٹ کی ذاتی دلچسپی کے باوجود میں نہیں جانتا تھا کہ کب تک پولیس کی حراست میں رہنا پڑے گا۔

''ہم اس پر کام کر رہے ہیں، رے''میرے پاس جتنی طاقت ہے وہ میں لگا رہی ہوں۔میں وعدہ کرتی ہوں۔تم جلد باہر ہوگے۔''

کارمیلا کی آواز اور لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کوششیں کر رہی ہے۔

Scanned with CamScanner

11

لاہور پولیس ٹریننگ کالج، لاہور

(29 جنوری، تیسرا دن)

تمام تر مشکل تجربات کے باوجود مجھے پتہ نہیں تھا کہ کتنی دیر قید رہنا تھا؟

قونصل خانے کے اہلکاروں نے اپنے ابتدائی دورے کے دوران بھی کچھ بتانے سے احتراز کیا تھا۔ شائد انہیں بھی پتہ نہیں تھا۔ کوئی بھی حتمی تاریخ دینے کے قابل نہیں تھا۔ کیا میں طویل عرصہ تک قید رہنے کی منصوبہ بندی کرلوں ...... میں نے سوچا۔ ایک ہفتہ، ایک ماہ، یا ایک سال .... میں نہیں جانتا تھا۔ بلکہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ کوئی اگلہ لمحہ ایسا بھی ہوسکتا ہے یا اگلا گھنٹہ، جب میری رہائی کا حکم آجائے۔ مجھے اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

غیر ملک میں گرفتاری جس طرح کی بے چارگی اور مایوسی کے احساس سے دوچار کرتی ہے، وہ مجھے شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگی تھی۔ جب کسی غیر ملک میں آپ کی مرضی کے خلاف کچھ ہو رہا ہو تو آپ کا دماغ صورتحال سے نمٹنے کے لیے بہتر انداز میں کام کرتا ہے۔ مجھے اس قسم کی صورتحال سے نمٹنے کی تربیت دی گئی تھی کہ کیسے صورتحال کو اپنے حق میں استعمال کرنا ہے۔ منفی خیالات کو کیسے نظر انداز کرنا ہے۔

قونصل خانے کی ٹیم کے جانے کے بعد میں بستر پر دراز ہوگیا اور اگلے 24 گھنٹے سویا رہا۔ اہلکار نے ایک بار پھر مجھے بتایا کہ قونصلیٹ کی ٹیم دوبارہ ملنے کیلئے آئی ہے۔ کارمیلا کی

Scanned with CamScanner

دی ہوئی کاپی پر میں نے اپنی بیوی اور بیٹے کے نام پیغام میں لکھا کہ میں اُن سے بہت پیار اور انہیں بہت یاد کرتا ہوں اور حالات جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں نے پولیس اہلکاروں سے اپنے اس پیغام کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ میری تفتیشی ٹیم نہیں جانتی تھی کہ میرا امریکی فوج کی کس برانچ سے تعلق ہے۔ بطور کنٹریکٹر میری ذمہ داری دفتر خارجہ کے عملے کی حفاظت تھی۔ مگر کیا یہ ذمہ داری مجھے سفارت کار بناتی تھی؟ یقین کے ساتھ نہیں۔ پاکستان جیسا ملک جہاں لوگ مختلف قسم کے منفی رجحانات کا شکار اور جہاں سازش کی کہانیاں گردش کرتی رہتی ہیں، میرا ایک خاص ایجنسی سے تعلق کی کہانی پولیس اہلکاروں کا میرے ساتھ رویہ تبدیل کر سکتی تھی۔ فیملی کے نام پیغام میں نے قونصلیٹ جنرل کے اسسٹنٹ شین کے ہاتھ میں دیا جس کیلئے میں نے گرم جوشی کیساتھ شین سے ہاتھ ملایا۔ میں نے اسے کہا کہ میرے فوجی بیک گراؤنڈ کو چھپایا جائے۔ ورنہ اس طرح مجھے ایک جاسوس سمجھا جائے گا۔

ملاقات کے دوران کارمیلا نے مجھے صاف بتایا:

"میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی رے، مجھے تمہیں رہائی دلانے میں مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ ہم وکلا سے بات کر رہے ہیں۔ 14 روزہ جسمانی ریمانڈ کے دوران پولیس کچھ بھی پوچھ سکتی ہے، میں دوران تفتیش پولیس کو بتاؤں کہ میری تعیناتی امریکی سفارت خانے میں ہوئی تھی اور یہ مطالبہ کروں کہ مجھے اسلام آباد میں سفارتی مشن کے حوالے کیا جائے۔ 14 دن ختم ہونے کے بعد پولیس مزید پوچھ گچھ نہیں کرے گی۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ کارمیلا نہیں جانتی تھی کہ مجھے کس قسم کی ٹریننگ دی گئی ہے۔ میں نے مسکرا کر جواب دیا:

کوئی مسئلہ نہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔ چودہ دن تو بہت آسان ہیں۔"

جسمانی ریمانڈ کے دوران کھانے میں مجھے روزانہ چاول اور مرغی کا سالن کافی مقدار

Scanned with CamScanner

میں دو مرتبہ ملتا تھا، جسے میں دانستہ کھانے سے انکار کرنا شروع کر دیا۔اس سے پہلے میکڈونلڈ اور پیزاہٹ سے کچھ کھانے کولا کر دیا جاتا۔ مجھے پینے کیلئے ایک لٹر پانی کی بوتل ملتی جو میں ایک دو گھنٹے میں خالی کر دیتا اور مزید پانی مانگتا۔اس پر گارڈز نے مجھے کئی بوتلیں اکٹھی دینا شروع کر دیں۔ پولیس نے پہلے دن سے میری گھڑی، کیمرہ، موبائل فون قبضے میں لے لیا تھا،اس سے مجھے یہ بھی پتہ نہ چلتا کہ ٹائم کیا ہوا ہے؟ کمرے میں 24 گھنٹے بلب روشن رکھے جاتے تھے،علاوہ ازیں پوچھ گچھ کیلئے وہ کسی وقت بھی کمرے میں داخل ہو کر کوئی بھی سوال کر سکتے تھے۔ پاکستانی پولیس کے بارے میں میری جو معلومات تھیں، مجھے امید نہیں تھی کہ مہارت کے فقدان کے باعث وہ مجھ سے کوئی بات معلوم کر سکتے یا اگلوا سکتے ۔ لاہور میں محض ایک درجن سے زائد تفتیشی پولیس افسر ہیں، جنہیں مہینے میں 250 کے لگ بھگ کیسز نمٹانا ہوتے ہیں۔کچھ تفتیشی افسر کافی اچھی طبیعت کے مالک تھے، بعض پوچھ گچھ کے دوران موضوع سے ہٹ کر فضول سوالات پوچھنا شروع کر دیتے تھے، جیسے کہ

''کیا آپ بہتر محسوس کر رہے ہیں؟''

''جی ہاں!''

''کیا آپ کو مزید پانی کی ضرورت ہے؟''

''نہیں۔میرے پاس ہے۔''

''کیا آپ کو مزید کھانا چاہیے؟''

''جی، چاہیے۔''

اس طرح کے سوال پوچھے جاتے۔

پولیس افسر میرے بیڈ کے ساتھ اس کرسی پر بیٹھ جاتے جہاں میں کوئی میگزین پڑھ

Scanned with CamScanner

رہا ہوتا۔

''ہم بہت مختلف کہانیاں سن رہے ہیں۔ ہم آپ کی کہانی دوبارہ سننا چاہتے ہیں۔''

اس طرح مجھے مزنگ چونگی واقعہ کی تفصیلات کئی مرتبہ مختلف پولیس افسروں کو سنانا پڑیں۔ میں میگزین سائیڈ پر رکھتا اور انہیں کہتا:

''آپ جانتے ہیں، اگر آپ مجھ سے کوئی معلومات حاصل کرنے کے خواہاں ہیں تو آپ ایک سوال پوچھنے سے قبل مجھے ایک سوال کا جواب دینے دو۔ آپ سوالات شروع کرنے سے پہلے تحقیقات شروع کر دیتے ہیں۔ میں آپ کے سوالات کا جواب نہیں دے رہا۔''

انہی میں ایک پولیس افسر طارق خوش اخلاقی اور شستہ انگریزی کی وجہ سے مجھے بہت پسند تھا۔

''آج کیسا جا رہا ہے سر!'' آفیسر طارق پوچھتا۔

''بہترین....''

''کیس کے بارے میں سوچ رہے ہو؟''

''میں نہیں جانتا، میں کوئی اٹارنی تو ہوں نہیں۔''

اس کی آنکھیں پھیل جاتیں۔ ''یہ ٹھیک نہیں ہے۔ ہر ایک کو اٹارنی رکھنے کا حق ہے۔ ہر کوئی.....''

''آپ کی ایمبیسی کو کوشش کرنی چاہیے۔''

''مجھے یقین ہے کہ وہ کوشش کر رہے ہیں۔''

ایک موقع پر طارق نے کہا کہ اُس کا بھائی امریکی ریاست جارجیا میں پرانی گاڑیوں کا کام کرتا ہے۔ اس نے ان لوگوں کے نام گنوانے شروع کر دیئے جنہیں وہ امریکہ میں

Scanned with CamScanner

جانتا ہے۔اس پر مجھے لگا کہ طارق میرے ساتھ تعلق جوڑ کر دوبارہ سے مزنگ چونگی دقوعہ کی بات شروع کر دے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا، طارق نے مجھ سے کبھی نہ پوچھا کہ میں لاہور میں کیوں آیا اور کیا کر رہا تھا۔ وہ صرف امریکی فلموں، ثقافت اور طرز زندگی کی باتیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک اور پولیس افسر نے مجھ سے براہ راست تفتیش کی، وہ بے تکلفی کے ساتھ کمرے میں بیٹھا اور بتایا کہ اسے امریکی ایف بی آئی نے تربیت دی ہے۔اس کا انداز باقی پولیس افسروں سے قطعی مختلف تھا۔ سفید پینٹ شرٹ اور ٹائی میں وہ پولیس افسر کے بجائے بینکر لگتا تھا۔اُس نے مجھ سے پوچھا۔

''کیسے ہیں آپ؟ کیا یہاں آپ سے یہاں بہتر برتاؤ ہو رہا ہے؟ کیا کسی چیز کی ضرورت ہے؟ پاکستان کے بارے میں کیا سوچتے ہو؟

''میں نے ان تمام سوالات کا جواب دیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا سوال ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' پھر بولا۔

''کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ بہترین ملک ہے؟''

''ہاں! میں سمجھتا ہوں۔ یہاں تمھارے جیسے بہترین لوگ موجود ہیں۔''

''لاہور کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''زیادہ نہیں۔ مجھے یہاں آئے ہوئے صرف چھ دن ہوئے ہیں۔''

''لاہور میں کبھی ڈی ایچ اے گئے ہو؟''

جواب دیتے ہوئے میں نے انتہائی احتیاط سے کام لیا اور کہا۔

''ایک آدھ بار جانا ہوا ہے۔''

Scanned with CamScanner

ڈی ایچ اے یعنی ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی منصوبہ بندی کے ساتھ بسائی گئی فوجی افسران کی رہائشی کالونی تھی۔ یہاں سے میں کئی بار گزرا تھا،لیکن میں نے یہ بات تسلیم نہیں کی۔ کیونکہ میں کہہ چکا تھا کہ میں لاہور کی لوکیشن کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ ہماری گفتگو ریکارڈ ہو رہی تھی۔ پولیس اس گفتگو کو عدالت میں میرے خلاف شواہد کے طور پر پیش کر سکتی تھی۔ اس لیے میں محتاط تھا اور میں نے اپنا منہ بند رکھا۔

''تم نہیں جانتے کہ DHA کہاں ہے؟''

''نہیں میں نہیں جانتا،تم کس کے بارے میں گفتگو کر رہے ہو؟''

''او کے۔ اب ہم اصل واقعے کی طرف آتے ہیں۔''

''میں معذرت خواہ ہوں۔ جو میں جانتا ہوں وہ سب کچھ پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ آپ کے پاس میرا تحریر شدہ بیان موجود ہے۔ میں آپ کو کسی مزید سوالوں کے جواب نہیں دے سکتا۔''

پولیس آفیسر ''بیک فٹ'' پر چلا گیا لیکن ریسٹ کرنے کے لیے وہیں بیٹھا رہا۔ وہ چھ گھنٹے میرے کمرے میں رہا۔ وہ لنچ اور ڈنر کرتے ہوئے میری تمام حرکات وسکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ حتیٰ کہ جب میں واش روم گیا تو بھی مجھے جاتا دیکھتا رہا۔

اس نے کئی بار مجھ سے مزنگ چونگی واقعے کے بارے میں گفتگو کرنا چاہی لیکن میں نے ہر بار اس کا منہ بند کر دیا۔ بالآخر وہ چلا گیا۔

Scanned with CamScanner

ابو حذیفہ

12

لاہور پولیس ٹریننگ کالج، لاہور

(یکم فروری، چھٹا دن)

پولیس کی پوچھ گچھ کے دوران جب میں منہ بند رکھتا تھا تو مجھے تنگ کرنے کے لیے کئی مرتبہ مختلف عدالتوں میں پیش کیا گیا۔ ایک عدالت میں مجھے بلالائسنس اسلحہ رکھنے کے الزام اور دوسری مرتبہ مزنگ چونگی میں 2 افراد کے قتل کے الزام میں پیش کیا گیا۔ دونوں عدالتوں کا منظر ایک جیسا تھا یعنی چھوٹے تاریک اور غیر ہوادار کمرے جو کسی صورت کمرہ عدالت نہیں دکھائی دیتے تھے، اس کے باوجود درجنوں افراد کمرے میں اپنے لئے جگہ بنا لیتے تھے۔

ایک صبح مجھے روٹین کے مطابق عدالت میں پیش ہونا تھا۔ میرا معمول وہی تھا، شیو کی، سوٹ پہنا اور اتنی دیر میں قونصل خانے کے لوگ پہنچ گئے۔ عدالت میں پیشی کے دوران میں نے اہم تبدیلی پراسیکیوٹر بٹ صاحب کے بیان میں نوٹ کی۔ پہلی پیشی پر پراسیکیوٹر نے عدالت کو بتایا تھا:

"مسٹر ڈیوس نے 2 ایسے افراد قتل کیے جو اسے گولی مارنا چاہتے تھے، دونوں کے پاس اسلحہ اور گولیاں تھیں۔"

مگر اگلی مرتبہ پراسیکیوٹر نے عدالت سے کہا:

Scanned with CamScanner

''مسٹر ڈیوس نے 2 مسلح افراد قتل کئے جو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ یہ درست ہے کہ دونوں کے پاس پستول تھے مگران کے چیمبر خالی تھے۔''

اس غلط بیانی کی وجہ پولیس افسروں کی جانب سے دیا گیا مواد تھا۔

تیسری مرتبہ عدالت میں پراسیکیوٹر نے دعویٰ کیا کہ میں نے جنہیں گولیاں ماریں، وہ آئی ایس آئی کے ایجنٹ تھے۔ وہ دونوں ڈی ایچ اے میں کسی کے ساتھ میری خفیہ ملاقات کے بعد سے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ ایک پولیس افسر نے پوچھ گچھ کے دوران کیوں کہا تھا کہ اسے امریکی ایف بی آئی نے تربیت دی اور یہ کہ کبھی میں ڈی ایچ اے گیا ہوں کہ نہیں۔

چوتھی پیشی میں پراسیکیوٹر، بٹ صاحب نے دعویٰ کیا کہ دونوں موٹر سائیکل سوار مقتولین غیر مسلح تھے۔ پراسیکیوٹر کے اس دعوے کو غلط ثابت کرنا میرے لئے بہت مشکل تھا کیونکہ میرا کیمرہ پولیس والوں کے پاس تھا جس میں دونوں موٹر سائیکل سواروں کی تصاویر تھیں جن میں مقتول فہیم کے ہاتھ میں پستول واضح دیکھا جا سکتا تھا۔ مجھے زیادہ تکلیف اس بات پر تھی کہ پراسیکیوٹر کے ہر مرتبہ بیان بدلنے کے باوجود جج نے کبھی اسے ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

پاکستان کے کمزور عدالتی نظام کا ذکر 2008ء کی یو ایس ایڈ رپورٹ میں کافی وضاحت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ عدالت میں پانچویں پیشی کے بعد میں نے قونصل جنرل کارمیلا سے اپنی مایوسی کا ذکر کیا اور پوچھا کہ مجھے وکیل مل سکتا ہے؟

اگلی پیشی پر مجھے معاون مل گیا، اس کا تعلق امریکی قونصلیٹ سے تھا اور وہ اچھی اردو بول سکتا تھا۔

جب جج صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کو ڈیفنس کون کرے گا تو ایک شخص کھڑا ہو

Scanned with CamScanner

گیا۔ وہ چہرے سے امریکی نظر آتا تھا لیکن اس نے بڑی ساختہ اردو بولی۔

''میں امریکن قونصلیٹ سے ہوں اور مسٹر ڈیوس کی طرف سے بات کروں گا۔''

سمیر اگرچہ وکیل تو نہیں تھا لیکن اس نے میرا کیس بہتر انداز میں پیش کیا۔ وہ جتنی اچھی اردو بولتا تھا، اسی طرح انگلش بولتا تھا۔

جب میں نے موٹر سائیکل سواروں کو گولی ماری تھی تو یہ بحث شروع ہو گئی تھی کہ مجھے سفارتی استثنیٰ حاصل ہے یا نہیں۔ وہ پاسپورٹ اور ویزا جس کے ذریعے، میں نے پچھلے دوروں میں پاکستان کا سفر کیا تھا، 2010 کے اختتام تک ختم ہو چکا تھا۔ اس دوران مجھے نیا سفارتی پاسپورٹ اور ویزہ جاری ہو چکا تھا جس کی معیاد 2016 تک تھی۔

امریکی حکومت کے نمائندے یا کنٹریکٹر کیلئے پاکستانی ویزے کی درخواست کی منظوری پاکستانی سفیر دیتا ہے۔ پاکستانی حکومت کے نرم موقف کی وجہ سے حسین حقانی بڑی فراخ دلی سے امریکی حکام کو ویزے جاری کیا کرتے تھے، انہوں نے ہی میرے اور دیگر امریکی کنٹریکٹرز کے ویزوں کی منظوری دی۔ حکومت پاکستان نے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ سے میرے بارے میں پوچھا۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ ریکارڈ اپ ڈیٹ نہ کرنے کے باعث بر وقت جواب نہیں دے سکا۔ چنانچہ پاکستانی وزارت خارجہ نے مجھے سفارتی ایکریڈیشن کارڈ جاری کرنے سے انکار کر دیا۔

امریکی سفارت خانے نے اس حوالے سے ایک پریس ریلیز بھی جاری کیا۔ 28 جنوری کو مجھے لاہور کے امریکی قونصل خانے کا رکن ظاہر کیا گیا۔ 30 جنوری کو بتایا گیا کہ میں امریکی سفارت خانے کے ٹیکنیکل ایڈمنسٹریٹو سٹاف میں شامل ہوں۔ لیکن اس پریس ریلیز کو اتنی اہمیت ہی نہیں دی گئی۔

گمنام امریکی اہلکاروں کی بڑھتی تعداد پر نالاں پاکستانی حکام نے امریکہ کو ہراساں

کرنے اور اپنا ایجنڈہ آگے بڑھانے کیلئے میرا کیس اچھالنا شروع کر دیا۔

سب سے زیادہ موقع پرستی کا مظاہرہ کیمرج سے فارغ التحصیل پاکستانی وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے کیا۔حکومت کے اصرار پر مجھے سفارتی استثنیٰ دینے سے انکار کرتے ہوئے انہوں نے 30 جنوری کو اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔

اپنے بیان میں انہوں نے کہا کہ ویانا کنونشنز 1961 اور 1963 کے تحت امریکی سفارت خانے کا اندھے استثنیٰ کا مطالبہ کسی صورت جائز نہیں۔

یکم فروری کو کانگریس کے وفد نے صدر زرداری اور وزیراعظم یوسف رضا گیلانی سے علیحدہ علیحدہ ملاقات کی، جس میں ویانا کنونشنز کے تحت میری رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ امریکہ سے اچھے تعلقات کے باوجود صدر زرداری سیاسی طور پر اتنے مضبوط نہیں تھے کہ میرا مسئلہ حل کر سکتے ۔میری رہائی کی حمایت پر اُن کے خلاف مظاہرے ہو سکتے تھے۔زرداری نے میری قسمت کا فیصلہ دوسروں پر چھوڑ دیا، وزیراعظم گیلانی بھی اس بحران پر کچھ نہیں کرنا چاہتے تھے۔انہوں نے قومی اسمبلی میں بیان دیا کہ یہ کیس اب عدالتی کیس بن چکا ہے اور عدالت ہی اس کا فیصلہ کرے گی۔اس طرح انہوں نے اپنی جان چھڑا لی۔اس دوران ایک وکیل نے لاہور ہائیکورٹ میں درخواست دائر کر کے مجھے رہا کرنے کی کوششوں پر پابندی لگانے کی استدعا کی جس پر عدالت عالیہ کے چیف جسٹس اعجاز احمد چوہدری نے اتفاق کیا اور مجھے امریکی حکام کے حوالے کرنے روکنے اور میرا نام ای سی ایل میں ڈالنے کا حکم جاری کر دیا۔ای سی ایل میں صرف منشیات کے اسمگلروں، دہشت گردوں اور کرپٹ سیاست دانوں کے نام ڈالے جاتے ہیں۔اس طرح میرا نام اور تصویر ملک کے ہر ایئرپورٹ، بس اسٹینڈز اور پاکستان سے باہر جانے والے تمام چیک پوائنٹس پر بھجوا دی گئی تاکہ میں پاکستان سے بھاگ نہ سکوں۔

Scanned with CamScanner

ابو حذیفہ

13

لاہور پولیس ٹریننگ کالج، لاہور

(6فروری، 11واں دن)

یہ ایک کھلی حقیقت تھی کہ اس دوران میرے متعلق میڈیا پر جولاتعداد سازشی کہانیاں گردش کر رہی تھیں ان کے پیچھے پاکستانی حکومت کا ہاتھ تھا۔حکومت اور اس کے طاقت ور ادارے میڈیا کو استعمال کرتے ہوئے نت نئی باتیں سامنے لا رہے تھے۔حکومت نے میڈیا کو جو سٹوریز فیڈ کی تھیں وہ سراسر جھوٹی اور بہتان تراشی کے مترادف تھیں۔تمام اخبارات میں یہ جھوٹی کہانیاں چھپ رہی تھیں اور ٹیلی ویژن چینلز اسے سنسنی خیز انداز میں دکھا رہے تھے۔

ان کہانیوں میں مجھے ایک جاسوس قرار دیا جا رہا تھا۔میڈیا پر یہ خبریں رک نہیں رہی تھیں۔اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ پاکستانی سازشی تھیوریز پر یقین رکھتے ہیں۔پاکستانی جرنلسٹ مہدی حسن نے کرکٹ سٹار اور سیاست دان عمران خان سے پوچھا کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ انہوں نے وضاحت سے جواب دیا کہ پاکستان کے لوگوں سے ان کے راہنما ہر وقت جھوٹ بولتے ہیں۔جب معاشرہ ہر وقت جھوٹ سنتا ہے تو پھر سب کچھ سازش لگتا ہے۔

جب پاکستان کے سابق صدر اور فوج کے سربراہ جنرل ضیاالحق 17اگست 1988 کو طیارے کے ایک حادثے میں مارے گئے تو یہ افواہیں سامنے آئیں کہ ان کی ہلاکت میں

Scanned with CamScanner

امریکی سی آئی اے کا ہاتھ ہے۔ حالانکہ اس طیارے میں جنرل ضیا کے ساتھ امریکی سفیر رابن رافیل بھی مارے گئے تھے۔ اب سی آئی اے کو کیا ضرورت ہے کہ وہ جنرل ضیا کے ساتھ اپنے سفیر کو بھی مارے۔ اسی طرح کبھی اس حادثے میں بھارت کو ملوث قرار دیا گیا۔ پاکستان میں جنم لینے والی ایک اور سازشی تھیوری یہ بھی سننے میں آئی کہ اسامہ بن لادن دراصل یہودی ہیں۔ یہ بھی یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ اسامہ بن لادن درحقیقت امریکی ایجنٹ تھے اور ان کی ہلاکت 2000 میں ہوگئی تھی۔

میڈیا مسلسل ایسی خبریں چلا رہا تھا جس سے مجھے برے سے برا آدمی بنا کر پیش کیا جائے۔ میرے بارے میں بہت سی سازشی تھیوریز گردش کر رہی تھیں۔ ایک کہانی میں مجھے بلیک واٹر نامی ٹیم کا حصہ قرار دیا گیا جو پاکستان کے جوہری ہتھیار چرانے کی کوششیں کر رہی ہے۔ ایک میڈیا نے خبر جاری کی کہ مجھے فون پر صدر اوباما سے رابطے کی سہولت حاصل ہے۔ یہ خبر بھی اڑائی گئی کہ میں نے پاکستان کے حساس مقامات کی تصاویر بنائی ہیں، جن میں نیوکلیئر تنصیبات شامل ہیں۔ پنجاب کے صوبائی وزیر رانا ثنا اللہ نے میرے کیمرے سے کچھ مبینہ تصاویر کو بطور شہادت میرے خلاف استعمال کرنے اور مجھے جاسوس ثابت کرنے کی کوششیں کیں اور یہ کہا کہ ایک سفارت کار کا یہ کام ہے؟

میرے خلاف سب سے منفی کہانی جسمانی ریمانڈ کے 14 ویں روز پولیس اور پاکستانی حکومت نے پھیلانے کی کوشش کی۔ اس بارے میں مجھے قونصلیٹ کے لوگوں نے بتایا۔

یہ کہانی مقتول محمد فہیم کی بیوہ شمائلہ کنول کے زہریلی گولیاں نگلنے سے متعلق تھی، اسے فیصل آباد کے الائیڈ ہسپتال لے جایا گیا جہاں اس نے کیمرے کے سامنے بیان میں کہا کہ اسے انصاف کی امید نہیں، اس لئے احتجاجاً خودکشی کر رہی ہے۔ اس دوران میڈیا نے خبر جاری کی کہ شمائلہ کنول انتقال کر گئی ہے۔ میڈیا نے اسے شہید ثابت کرنے کی کوشش کی، یہ

Scanned with CamScanner

کہ اس کی ماں معذور ہے، اس کی چھ ماہ قبل فہیم سے شادی ہوئی تھی، فہیم کی موت کے بعد سے وہ سخت ڈپریشن کا شکار تھی۔ میرے لئے پریشانی کی بات یہ تھی کہ میں 9 روز قبل فہیم کی بیوہ کی خودکشی کی کہانی نوجوان لیفٹیننٹ کی زبانی سن چکا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ فہیم کی بیوہ نے اگلے روز ہی خودکشی کر لی تھی۔

میں حیران تھا کہ یہ کہانی کیوں 9 دن تک میڈیا سے چھپائی گئی۔ میرے خیال میں پاکستان کا خفیہ ادارہ آئی ایس آئی امریکہ مخالف جذبات بھڑکانے کیلئے میڈیا پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ یہ کوشش کچھ اس طرح کامیاب ہوئی کہ جماعت اسلامی کے کارکنوں نے الائیڈ ہسپتال کے باہر کنول کی ہلاکت کے خلاف جبکہ کچھ نے لاہور میں امریکی قونصلیٹ کے باہر مظاہرہ کیا۔ اس پراپیگنڈے میں مجھے عفریت بنا کر پیش کیا گیا، مظاہرین نے سڑکوں پر میرے پتلے جلائے اور مجھے پھانسی دینے کے مطالبے کئے۔ پولیس ٹریننگ کالج میں میری آزادی کے دن بھی ختم ہونے لگے، مجھے ایک چھوٹے اور تاریک کمرے میں رکھا جانے لگا۔ جیل میں میری آزادی ختم ہو چکی تھی۔ ان دونوں قونصلیٹ جنرل اور ان کے عملے سے ملاقاتیں میرے لئے ایک نعمت سے کم نہ تھیں۔

قونصلیٹ کے ایک شخص نے میرے اندر تبدیلی کو محسوس کیا۔ اس نے مجھے کچھ کتابیں اور ریڈنگ میٹریل لا کر دیا۔ میں کوئی اچھا ریڈر نہیں تھا۔ میں اکثر اوقات پڑھنے سے جان چھڑا لیا کرتا تھا۔ اس عرصے کے دوران میں نے اتنا مطالعہ کیا جتنا میں نے 36 سال کی زندگی میں نہیں کیا تھا۔ میں نے کلاسیک اور ٹین ایجر لٹریچر پڑھا۔ کچھ کتابیں مجھے کارمیلا نے اپنی ذاتی لائبریری سے لا کر دیں۔ جو خاتون مجھے کتابیں دینے آتی تو میں اسے پہلی کتاب واپس کر دیتا اور نئی لے لیتا۔

ایک بار جو کتاب میرے لیے آئی، وہ افغانستان میں سی آئی اے کے ایجنٹ کی

Scanned with CamScanner

یادداشتوں پر مبنی تھی۔ میں نے ٹائیٹل اور بیک کور دیکھ کر اسے اپنے تکیے کے نیچے چھپالیا۔ معمول کے مطابق جب قونصلیٹ کی آفیسر کتاب دینے اور لینے آئی تو میں نے اسے کتاب دکھائی۔ وہ بھی بڑی حیران ہوئی۔

''آپ نے مجھے بڑی مختلف کتاب دی۔ میں اسے نہیں پڑھ سکا۔''

''اوہو، یہ بہت برا ہوا۔'' جب اس نے کتاب کے بیک کور پر تفصیل پڑھی تو اس کے چہرے کے تمام رنگ تبدیل ہو گئے۔

جب مجھ پر جاسوسی کے الزامات ہیں تو اس طرح سی آئی اے ایجنٹ کی کتاب پڑھنے سے، جو کسی کو قتل کرنے کی کوشش کر رہا ہے، کوئی بھی میرے بارے میں اس طرح کا خیال لا سکتا ہے۔

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

ابو حذیفہ

14

لاہور پولیس ٹریننگ کالج، لاہور

(10 فروری، 15 واں دن)

میرا چودہ روزہ جسمانی ریمانڈ ختم ہونے کے نزدیک تھا اور میں یہ توقع کر رہا تھا کہ اب پولیس اب مجھ سے اور جارحانہ رویہ اختیار کرے گی۔ انہوں نے مجھے کبھی نہیں مارا لیکن اپنے مطالبات اور تحقیقات کے لیے اپنے حربے ضرور استعمال کرے گی۔

''کون سا کام کرتے ہو؟ کہاں کام کرتے ہو؟ حادثے کے بعد میری مدد کے لیے آنے والے کون تھے؟'' وہ یہ ضرور پوچھیں گے۔

لیکن میرے پاس بتانے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

''نہیں، میں معذرت خواہ ہوں۔ میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔''

وہ بار بار مجھے سے وہی کہانی سنانے کی فرمائش کرتے رہے۔ جس دن میرا ریمانڈ ختم ہونا تھا، اس سے ایک روز پہلے رات کے وقت دو گارڈز میرے کمرے میں داخل ہوئے اور مجھے بیڈ سے اٹھا کر کہا:

''انٹرویو''

میں اس روز قونصل خانے کے سٹاف کو بتا چکا تھا کہ ہوسکتا ہے کہ آج وہ دوبارہ مجھ سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ممکن ہے کہ کوئی اچھی خبر ہو اور یہ بھی ہوسکتا ہے

Scanned with CamScanner

کہ مجھے کہیں دروازوں کے پیچھے دھکیل دیا جائے۔
گارڈز مجھے اٹھا کر نیچے لے گیا۔لیکن معمول کی طرح سیڑھیوں سے نیچے جانے کی بجائے مجھے ایک ہال میں لے جایا گیا۔میں نے یہ جگہ پہلے نہیں دیکھی تھی۔میرے پیٹ نے اعصابی کمزوری کا جھٹکہ کھایا۔میں جانتا تھا کہ عدالت میں جج نے حادثے کے متعلق کیا پوچھنا ہے اوراب تحقیقات کرنے والوں نے اعصابی طور پر مجھے توڑنے کی کیسے کوشش کرنی ہے۔میں اس کے لیے اپنے آپ کو تیار کر چکا تھا۔
گارڈز نے مجھے اندر دھکیلا۔میں کمرے میں داخل ہوا تو درمیان میں ایک کرسی پڑی تھی۔دائیں طرف کرسی پر سپرینڈنٹ فاروق اوراس کے ساتھ ڈی ایس پی کاظمی بیٹھا تھا جو پہلے دن سے میرے کیس کو دیکھ رہا تھا۔ان کے پیچھے تین اور افراد بھی کھڑے تھے۔ان سب کو ایک آدمی ہیڈ کر رہا تھا۔شاندار سوٹ میں ملبوس اس شخص کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔میرے سامنے اس کا تعارف پولیس آفیسر کے طور پر کرایا گیا لیکن مجھے وہ کسی بھی طرح پولسی کا آدمی نہیں لگ رہا تھا۔میرا خیال تھا کہ اس کا تعلق آئی ایس آئی سے تھا۔
ایک پولیس افسر نے خالی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔
"پلیز سر، بیٹھ جائیے۔" میرے بیٹھتے ہی اس نے پھر حادثے کے متعلق سوال پوچھنے شروع کر دیئے۔
لیکن میں نے اس کے سوال درمیان میں ہی کاٹ دیا اور بولا:
"دیکھیں، میں کسی اور سوال کا جواب دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔آپ کے پاس میرا اسٹیٹمنٹ ہے۔"
"آپ کیوں ہمارے سوالوں کے جواب نہیں دیں گے۔"
"کیونکہ آپ سب کچھ جانتے ہیں، جو کچھ میرے سٹیٹمنٹ میں لکھا گیا ہے اور جو میں

Scanned with CamScanner

نے آپ کو دیا ہے۔وہ آپ سب کے پاس ہے۔اس لیے مزید کسی سوال کے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔یہ صرف وقت کا ضیاع ہے۔"

"میرے پاس سفارتی پاسپورٹ ہے۔امریکی سفیر کہہ چکے ہیں کہ مجھے سفارتی استثنیٰ حاصل ہے۔میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔"

"لیکن سر،ہمیں آپ کے جواب کی ضرورت ہے۔یہ ضروری ہے۔"

میں کرسی سے کھڑا ہو گیا۔" آپ جانتے ہیں کیا.....میں اپنے کمرے میں جارہا ہوں۔"

مین دروازے تک آیا اور انتظار کرنے لگا کہ گارڈز دروازہ کھول دے۔آفیسر فاروق کھڑا ہو گیا اور لگ رہا تھا کہ وہ دروازہ کھول دے گا۔

اچانک کمرے میں انٹروگیشن کو کنڈکٹ کرنے والے آفیسر کی آواز گونجی:

"آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت نہیں ہے۔آپ کی جگہ یہاں ہے۔"

مجھے دوبارہ کرسی پر آکر بیٹھنا پڑا۔

ایک پولیس آفیسر نے سوالات کے سلسلے کو دوبارہ جوڑا۔

میں نے پھر اس کی بات کاٹی اور ان سے پوچھا؛کیا آپ کے پاس میرا پاسپورٹ ہے؟

"ہاں ہے۔"جواب ملا۔

" آپ سب اسے غور سے دیکھیں۔اس کے پہلے صفحے پر لکھا کہ یہ ڈپلومیٹک پاسپورٹ ہے اور اس حیثیت سے مجھے سفارتی استثنیٰ حاصل ہے۔اس لیے میں ابھی اس وقت سفارتی مشن اسلام آباد جانا چاہتا ہوں۔انڈرسٹینڈ......"

"لیکن سر،اگر آپ ہمارے سوالوں کے جواب دے دیں تو ہم آپ کو جانے دیں

Scanned with CamScanner

گے۔آپ ہم سے بات کیوں نہیں کرنا چاہتے؟"

"کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میں کس سے بات کر رہا ہوں۔میں تمہیں جانتا ہوں کیونکہ تم حادثے کے پہلے دن پولیس یونیفارم میں ملبوس تھے۔میں آفیسر کاظمی کو جانتا ہوں، وہ حادثے والے دن وہاں موجود تھے۔ان کا نام میں بیج پر پڑھ سکتا ہوں۔میں آفیسر فاروق کو جانتا ہوں۔میں پیچھے کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہیں جانتا۔یہ بلیو سوٹ والے صاحب کون ہیں؟ میں نہیں جانتا۔شلوار قمیض میں جو صاحب ہیں، میں انہیں بھی نہیں جانتا۔"

انٹروگیشن کو ہیڈ کرنے والے شخص نے فوری طور پر جواب دیا۔

"آپ کو اس بات کا اختیار نہیں ہے کہ آپ جانیں، میں کون ہوں۔"

میں ہاتھ اپنی گود میں رکھے پرسکون رہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ شخص صورتحال کو مشکل سے مشکل بنا رہا تھا۔وہ میرے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس کی انگلی مجھے اپنے آنکھوں کے قریب محسوس ہو رہی تھی۔مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میری آنکھوں کو ہٹ کرنا چاہ رہا ہے۔مجھے اپنے سپیشل فورس کے انسٹرکٹر کا سبق یاد آ گیا کہ اگر ایسی صورتحال ہو تو براہ راست تصادم سے گریز کرنا چاہیے۔کیونکہ کمرے کے باہر بھی گارڈز موجود ہیں۔میرا دل چاہا کہ میں بھی اپنی انگلیاں اس کی آنکھوں کے قریب کر لوں۔یہ خیال میرے دماغ میں آیا لیکن صورتحال کے پیش نظر نکل گیا۔

میں اس وقت پریشان ہونے کی وجہ سے تھکا ہوا تھا۔اوپر سے بار بار انہی سوالات کے جواب دینے پر مجبور کیا جا رہا تھا جو میں پہلے بتا چکا تھا۔اعصابی جنگ شروع تھی۔

کچھ دیر کے بعد وہ نیچے بیٹھ گیا تو مجھے اپنی فتح کا احساس ہوا۔غصے کے آثار سب کے چہرے پر تھے۔شائد وہ افسوس کا اظہار کر رہے تھے کہ ریمانڈ ختم ہو چکا ہے اور وہ اپنی

Scanned with CamScanner

علاوہ یہ معلومات نہ لے سکے۔ وہ ناکام رہے تھے۔ ان کے پاس صرف آج کی رات تھی۔
اگر وہ آج مجھ سے کچھ نہ اگلوا سکے تو پھر ان کے پاس کوئی چانس نہیں تھا۔
ایک پولیس آفیسر نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور گارڈ کو کہا کہ انہیں کمرے میں چھوڑ آئیں۔
پولیس آفیسر کے الفاظ شکست کا اعتراف تھا۔ اُن آفیسرز نے مجھ سے تفتیش کے لیے کافی وقت لیا لیکن اہم معلومات کے حصول میں ناکام رہے۔
اب آگے کیا ہونے جا رہا تھا؟ میرے لیے یہ بہت اہم تھا۔

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

ابو حذیفہ

15

ماڈل ٹاؤن کچہری، لاہور

(10 فروری، 16 واں دن)

14 روزہ جسمانی ریمانڈ ختم ہونے کے بعد 11 فروری 2011 کو مجھے ماڈل ٹاؤن میں انسداد دہشت گردی کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس پیشی کے موقع پر مسلح فوجی دستے نے گاڑی کو گھیر رکھا تھا۔ ہر طرف AK47 سے مسلح سکیورٹی فورسز کے اہلکار کھڑے تھے۔ گاڑی بھی بلٹ پروف تھی۔ شیراڈ گاڑی کو کو موٹے اسٹیل اور بلٹ پروف کھڑکی نے کافی محفوظ بنا دیا تھا۔ اتنے زیادہ سکیورٹی انتظامات کی وجہ مذہبی انتہاپسندوں کی جانب سے خدشات تھے جو کہ عوام میں پذیرائی کیلئے میرا خون بہانا چاہتے تھے۔ سکیورٹی فورسز کے اہلکار دہشت گردوں سے مقابلے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

میں پہلے بھی عدالت آتا رہا تھا لیکن اتنے انتظامات پہلے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ الارم کی آوازیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ جب عدالت جانے والا راستہ تبدیل ہوا تو میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ کیا وہ مجھے ایک مختلف عدالت میں لے جا رہے تھے؟ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ پاکستانی حکام آخری لمحات میں جگہ تبدیل کر سکتے ہیں۔ جب قونصلیٹ کے وکیل نے ان سے پوچھا تو انہوں نے معذرت خواہانہ انداز

Scanned with CamScanner

میں کہا: ''کہ کیا آپ کو اطلاع نہیں ملی تھی؟''

گاڑی سست ہوئی تو پتہ چلا کہ ہم فیروز پور روڈ کے ٹریفک جام میں پھنس گئے ہیں۔ فوجی ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ اصل میں وہ ایک ٹریفک جام کو دور کر رہے تھے، جس نے ہماری رفتار کو سست کر دیا تھا۔ ٹریفک جام کی وجہ ایک گدھا گاڑی تھی جو گاڑیوں کے درمیان آ گئی تھی۔ گدھا گاڑی سامان سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ نتیجہ وہی ہوا کہ زیادہ سامان کی وجہ سے گدھے نے بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا اور وہ سڑک پر ہی بیٹھ گیا۔ یہ پورا منظر کارٹون کی طرح تھا لیکن میرے جیسے ہنسنے والوں کے لیے اس میں بہت پریشانی تھی۔

میں عدالت میں اپنے آپ کو محفوظ تصور نہیں کر رہا تھا۔ ہر طرف لوگ تھے اور میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔

جج نے پراسیکیوٹر سے پوچھا: ''مسٹر ڈیوس کے خلاف کیا کیس ہے؟''

''ہمیں مزید وقت چاہیے۔'' پراسیکیوٹر بٹ نے جواب دیا۔

'' آپ نے شواہد کے لیے چودہ دن پہلے لئے ہیں اور اب مزید وقت مانگ رہے ہیں؟''

مجھ سے تفتیش کرنے پولیس افسر نے جواب دیا: ''مسٹر ڈیوس! بہت مکار اور عیار ہے اور ہمارے سوالوں کے جواب نہیں دے رہا۔ ہمیں اس کا کیس بنانے کے لئے مزید وقت چاہیے۔''

''نہیں، آپ کے پاس چودہ دن تھے۔ یہ قانون ہے۔ آپ کو چالان پیش کرنا ہے۔''

پاکستان میں چالان ایک طرح کی تحقیقاتی رپورٹ ہے جس سے جرم کرنے والے

Scanned with CamScanner

اور اس کی نوعیت کی نشاندہی ہوتی ہے۔

میرے وکیل حسام قادری نے درخواست جمع کرائی جس میں استدعا کی گئی کہ مجھے سفارتی استثنیٰ حاصل ہے اور یہ کہ میرے خلاف مقدمہ بند کمرے میں چلایا جائے، پریس اور عوام کو عدالتی کارروائی سے دور رکھا جائے۔ وکیل حسام قادری کی انگریزی اچھی نہ ہونے کے باعث مجھے کافی مایوسی ہوئی۔

جج نے پراسیکیوٹر سے پوچھا کہ آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟" پراسیکیوٹر سے انکار کر دیا۔

جج نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا کہ" آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

" مجھے سفارتی استثنیٰ حاصل ہے۔ لہٰذا مجھے فوری طور پر رہا کیا جائے۔" میں نے کہا۔

بٹ نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اس نے دو لوگوں کو ہلاک کیا ہے اور اس پر دو لوگوں کے خون کا الزام ہے۔"

میں نے سمیر سے پوچھا کہ" بٹ نے مجھے کیا کہا ہے؟"

" رے! چھوڑ و اسے....."

دلائل سننے کے بعد عدالت نے مجھے دوبارہ 14 روزہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا۔

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ اس سے پاکستان کے عدالتی نظام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چودہ روزہ ریمانڈ کے بعد پھر چودہ دن کا ریمانڈ دے دیا گیا۔ عدالت نے اب یہ کیس ۲ فروری کو دوبارہ سننا تھا۔

ایک پولیس والے نے مجھے بازو سے پکڑا اور کہا:" سر، ہمیں اب چلنا چاہیے۔"

" نہیں، میں پراسیکیوٹر بٹ کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

سمیر میرے سامنے آ کھڑا ہوا اور کہنے لگا:" نہیں، رے، ایسا مت کرو۔"

سمیر نے مجھے بازو سے پکڑا اور دروازے کی طرف لے جانے لگا۔ میری 36 سالہ

Scanned with CamScanner

صاف ستھری زندگی میں پرنسپل کے دفتر میں جانا، 65 اور 75 کی سپیڈ سے گاڑی چلانے کے علاوہ کچھ نہیں تھا، لیکن اب میں ایک قیدی بن چکا تھا۔

کوت لکھپت جیل چار سو قیدیوں کے لیے بنائی گئی تھی لیکن یہاں اس سے چار گنا زیادہ قیدی موجود تھے۔ جیل میں تشدد کے واقعات عام تھے۔ کئی بار قیدیوں نے ہی ایک دوسرے کو مار دیا، اور کئی بار جیل حکام نے اور کئی بار عدالتی حکم پر پھانسی دے دی گئی۔

جیل کے گیٹ سے داخل ہونا خاصا مشکل کام ہے۔ جیل کے داخلی دروازے پر ایئر پورٹ کی طرح کا میٹل ڈیٹیکٹر دروازہ نصب تھا۔

گارڈ نے مجھے جیکٹ، جوتے اور بیلٹ اتارنے کو کہا اور ہر چیز کو مشین سے گزارا۔ اس کے بعد اس نے جیکٹ کے ہر حصے کی جانچ پڑتال کی تا کہ اس میں کوئی چیز چھپی ہوئی نہ ہو۔ اس کے بعد اگلے گیٹ پر ایک اور گارڈ نے سب چیزوں کو دوبارہ جانچ پڑتال کے عمل سے گزارا۔ جب میں جیل کے اندر پہنچا تو کلاک دوپہر کے 12:30 بجا رہا تھا۔ یعنی تلاشی کے اس عمل میں ایک گھنٹا لگا۔ میں 11:30 پر جیل پہنچا تھا۔

دو گارڈز نے مجھے ایک بہت بڑے دروازے کے نیچے سے گزارا۔ اتنا بڑا دروازہ میں نے فلموں میں ہی دیکھا تھا۔ سٹیل یا لوہے کا بنا ہوا دروازہ جیمز بانڈز کی فلموں میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس بڑے دروازے کے اندر ایک اور چھوٹا دروازہ تھا۔ اس دروازے کے باہر لکڑی سے تقسیم ہونے والا ایک بڑا کمرہ تھا۔ دائیں جانب تین کیبن تھے، گارڈز نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

''ہمیں آپ کے فنگر پرنٹ لینے ہیں۔'' سیٹ کے دوسری طرف بیٹھے آفیسر نے کہا۔

''نہیں، آپ نہیں لے سکتے۔'' میں نے جواب دیا۔

میری خواہش تھی کہ وہ میری تصویر لے لیں جیسا کہ جیل میں ہوتا ہے، لیکن انہوں

Scanned with CamScanner

نے میری بات نظر انداز کر دی۔

"میں امریکی سفارت خانے سے ہوں۔ مجھے سفارتی چھوٹ حاصل ہے اور مجھے غیر قانونی حراست میں رکھا گیا ہے۔ آپ مجھے فوری طور پر اسلام آباد سفارتی مشن پہنچائیں۔"

آفیسر نے میری بات کو مکمل طور پر نظر انداز کیا۔

"سر اپنی والدہ کا نام بتائیں۔"

"نو، میں تمھارے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔"

آفیسر نے کچھ وقت مجھ پر لگایا لیکن میں نے تعاون نہیں کیا۔ مجھے اس کی بے بسی اور مایوسی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

"میں آپ کے رویے کا قونصلیٹ سٹاف سے تذکرہ کروں گا جب وہ کل آپ کو ملنے آئیں گے۔ آپ نے تعاون سے انکار کیا، لیکن ہمیں یقین ہے کہ ہم مطلوبہ معلومات حاصل کر لیں گے۔"

اس کے بعد جیل آفیسر نے پیچھے کھڑے گارڈز کو کہا کہ انہیں سیل میں پہنچا دو۔

اس کے بعد میں جیل کی مین عمارت سے چلتا ہوا ایک بڑے صحن میں آ گیا۔ میں نے جیل کی دیواروں کا جائزہ لیا جو زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ ان دیواروں کے اوپر تار باندھے گئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر مجھے بھاگنا پڑے تو میں جیکی چن سٹائل میں ان دیواروں پر اوپر سے اوپر چڑھ سکتا ہوں، لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ ان دیواروں کے دوسری طرف کیا ہے؟ یہ پاگل پن کے خیالات تھے جو میرے ذہن میں آ رہے تھے لیکن میں نے انہیں جھٹک دیا۔

جب میں اپنے سیل میں آیا تو 7 بائی 3 کا کمرہ تھا جس میں ایک کرسی اور میز کے علاوہ

Scanned with CamScanner

دائیں طرف واش روم تھا، سنک اور شیشہ بھی تھا۔ یہاں کیمرہ بھی لگا ہوا تھا
بیڈ پڑا تھا۔ جس سے کمرے اور واش روم پر نظر رکھی جاسکتی تھی۔ باہر ایک مینار نما چوکی تھی جس پر مسلح
گارڈ کھڑا تھا اور وہ مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

میں نے سپرینڈنٹ جیل، جو مجھ سے قد میں چند انچ چھوٹا تھا، ان کیمروں کی بات کہا۔
اچھی انگلش بولتے ہوئے اس نے کہا کہ یہ آپ کی حفاظت کے لیے ہیں۔ جب تک میں
جیل میں رہا، سینکڑوں رینجرز کے سپاہی جیل کے اردگرد تعینات رہے۔ مجھے جس سیل میں
رکھا گیا تھا، وہ جیل کا سپیشل سیل تھا اور عام قیدیوں سے دور تھا۔ میرے سیل کے قریب سے
25 دہشت گردوں کو کہیں اور شفٹ کیا گیا اور ایسا میری حفاظت کے لیے کیا گیا۔

جب گارڈ نے میرے سیل کے دروازے کو باہر سے لاک کر کے مجھے بند کر دیا تو مجھے
پریشانی کا ایک جھٹکا لگا۔ میری زندگی اس وقت تکلیف میں آ گئی۔ میں کبھی بھی گرفتار نہیں ہوا
تھا اور کبھی جیل بھی نہیں گیا تھا۔ میری آزادی مجھ سے لی جا چکی تھی۔ میں اب بند دروازوں کا
قیدی تھا۔ میرا کنٹرول کسی اور کے ہاتھ میں تھا۔ میں ایک بند دروازے کے پیچھے پھنس گیا
تھا اور یہ میرے لیے ایک خوفناک احساس تھا۔ میں جان گیا تھا کہ جھاڑیوں میں پھنسے شیر کی
کیا حالت ہوتی ہے۔ مجھے ایک گارڈز کھانے کے لیے پیزا دے گیا تھا لیکن میں اسے
کھانے کے لئے بہت پریشان تھا۔ ہر طرح کے خوفناک خیالات میرے سر سے
گزر رہے تھے۔ کیا میں کبھی بھی اپنی بیوی یا بیٹا نہیں دیکھ سکوں گا۔

مجھے یقین تھا کہ میری بیوی ربیکا ساری صورتحال کو انڈرسٹینڈ کرنے کے باوجود
پریشان ہوگی، لیکن وہ فوج میں تھی اور صورتحال کو سمجھ سکتی تھی۔ لیکن وہ چھوٹے بچے کو کیسے
سمجھاتی۔ وہ کس طرح اسے وضاحت پیش کرتی۔ میں جب وہاں تھا تو اپنے بیٹے کو سکھاتا تھا
کہ پتنگ کو کیسے اڑیا جاتا ہے؟ فٹ بال کو کیسے پھینکا جاتا ہے؟ میں چھٹیوں میں اسے

Scanned with CamScanner

سوئمنگ پول میں لے جاتا اور اس کے ساتھ سکول تک واک کرتا۔ میں اس طرح اپنے بیٹے کو آگے بڑھتے اور بڑا ہوتے دیکھ کر خوش ہوتا، ابھی مجھے اسے اور بہت کچھ دینا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اس وقت میرے پاس اس سے بہترین محسوسات اور کوئی نہیں تھے۔

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

16

قونصل جنرل ریذیڈنس، لاہور

(15 فروری، 20 واں دن)

جب پاکستان 1947 میں معرض وجود میں آیا تو برطانوی انڈین آرمی کی تقسیم کے نتیجے میں جو فوج اس نوزائیدہ ملک کے حصے میں آئی، اسے سنبھالنا ایک مشکل کام تھا۔ اس وقت کے لیڈروں نے فیصلہ کہ بھارت جیسے بڑے ملک سے اپنے آپ کو بچانا اس وقت سب سے بڑی ضرورت ہے۔ حالانکہ انہیں اُس وقت فوج اور اس کے اخراجات کو کم کرنے کی ضرورت تھی لیکن بجائے فوجی اخراجات کم کرنے کے پاکستان نے اسے بڑھا لیا۔ 1950 میں میں پاکستان نے اپنے کل بجٹ کا 60 فیصد فوج پر لگا دیا۔ اس دوران کوئی نئی انڈسٹری نہیں لگائی گئی جس سے کہ ملکی معیشت بہتر ہوتی۔ یوں تمام تر توانائیاں بجائے معیشت بہتر کرنے کے فوج کو بہتر کرنے پر لگائی گئیں۔ امریکہ نے اُس وقت پاکستان کو 10 ملین ڈالر کی امداد دی اور یہ یقین دہانی حاصل کی کہ پاکستان خطے میں امریکی مفادات کو تحفظ فراہم کرے گا۔ پاکستان نے اس معاہدے سے کئی فوائد حاصل کئے۔ سرد جنگ کے دوران پاکستان، روس کے خلاف افغان جنگ کا ایندھن بنا۔ دونوں ملکوں کے اپنے مفادات تھے۔ افغانستان میں سی آئی اے نے پاکستان کی آشیرباد سے مجاہدین کو پشت پناہی کی، انہیں ٹریننگ دی اور جہاد کروایا جس کے نتیجے میں القاعدہ نے جنم لیا۔

پاکستان کو یہ رقم کافی نہیں لگ رہی تھی۔ امریکہ کی اس امدادی رقم سے پاکستان منشیات پیدا کرنے والا ملک بن گیا جواب امداد کے بغیر رہ ہی نہیں رہ سکتا تھا۔ 1954 سے 1959 کے درمیان، امریکہ نے پاکستان کو 1.28 بلین ڈالر امداد دی۔ 2011 تک، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے پاکستان کو دی جانے والی مجموعی امداد 67 بلین ڈالر تک پہنچ گئی تھی۔ نائن الیون کے بعد امریکہ نے پاکستان کی امداد کولیشن فنڈز سے مشروط کر دی اور کہا کہ پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ کرے۔ اس پالیسی نے پاکستانی فوج کی دہشت گردوں کے خلاف لڑنے کی حوصلہ افزائی کی۔ امریکہ اور پاکستان کے تعلقات میں ایک رخنہ یہ بھی تھا کہ امریکہ سمجھتا تھا کہ پاکستان کو دی جانے والی امداد پاکستانی فوج کے پاس چلی جاتی ہے۔

امریکی سینیٹر جان کیری اس خطے کے فلاح و بہبود کے لئے مصروف اور جمہوریت کو پھلتے پھولتے دیکھنے کے خواہشمند تھے۔ انہوں نے 2004 میں اپنے صدارتی انتخاب کے دوران افغانستان کا دورہ کیا تھا۔ میں اس وقت ان کی حفاظت کرنے والی ٹیم میں تھا۔ وہ اسی وجہ سے 2008 میں پاکستان گئے، کیونکہ فوجی آمر پرویز مشرف کی جگہ آصف علی زرداری نے لے لی تھی۔

2009 میں جے بائیڈن کے سینیٹ خارجہ تعلقات کمیٹی کے چیئرمین بننے کے بعد کیری کو پاکستان کے امور میں شامل کر لیا گیا۔ انہوں نے چار بار پاکستان کا دورہ کیا اور سینیٹر رچرڈ لوگر کے ساتھ مل کر بہترین شراکت داری کے تحت پاکستان کو دی جانے والی امداد کا بل منظور کیا۔ اس کیری لوگر بل کے تحت پاکستان کو پانچ سالوں میں 5.7 بلین ڈالر کی امداد دی جانی تھی۔ یہ رقم پاکستان میں صحت، تعلیم اور فلاح و بہبود کے لیے استعمال ہونی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کی آدھی سے زائد آبادی غربت سے نیچے زندگی گزار رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

کیری لوگر بل نے پاکستان کی امداد کو تین گنا کر دیا لیکن امداد کے ضوابط پر بہت سے لوگوں کو غصہ آیا۔ اس وقت کے صدر آصف علی زرداری نے اس کی حمایت کی، لیکن پاکستانی فوج نے اس بل پر سب سے زیادہ تنقید کی۔ فوج نے بل کی شقوں کے بارے میں "سنجیدہ تشویش" کا اظہار کیا کہ پاکستان کے اندر کام کرنے والے طالبان اور القاعدہ کے عسکریت پسندوں کے خلاف کارروائی کی بنیاد پر امداد ملے گی۔ بل میں یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر فوج نے بغاوت کی تو اسے امداد نہیں دی جائے گی۔

تین دن کے بعد اوبامہ نے پاکستان کی امداد کے اس بل پر دستخط کر دیئے اور یہ قانون بن گیا۔ پاکستان کے وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے فوری طور پر امریکہ کا دورہ کیا اور اوبامہ انتظامیہ کو پاک فوج کی تشویش سے آگاہ کیا۔ جان کیری، پاکستانی وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی کے ساتھ بہت اچھے تعلقات رکھتے تھے۔ وہ انہیں دوست کا درجہ دیتے تھے۔ حتیٰ کہ کیری نے شاہ محمود کے بیٹے زین قریشی کو اپنے سینٹ آفس میں انٹرن شپ بھی دلوائی تھی۔

لیکن جب جان کیری 15 فروری 2011 کو مجھے چھڑانے کے لیے پاکستان آئے، جہاں میں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل میں تھا تو شاہ محمود قریشی نے ان کے ساتھ دوستوں جیسا برتاؤ نہیں کیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ مجھے سفارتی استثنیٰ حاصل تھا، انہوں نے واقعے کے تین دن بعد اس ایشو پر استعفیٰ دے دیا۔ آصف علی زرداری اور وزیر اعظم گیلانی اپنے وزیر خارجہ سے میٹنگ میں انہیں اس بات پر قائل نہیں کر سکے کہ میرے حوالے سے اپنے موقف میں تبدیلی پیدا کریں۔

شاہ محمود قریشی نے ایک پریس کانفرنس میں کہا کہ "اگر مجھے عدالت کی طرف سے حکم آیا تو میں ایمانداری سے سچ بتاؤں گا۔ میں سچ کے ساتھ ہوں گا اور میں قوم کو مایوس نہیں کروں گا۔"

Scanned with CamScanner

اپنے دوروزہ دورے کے دوران جان کیری نے صدر زرداری، وزیر اعظم گیلانی اور آرمی چیف سے ملاقات کی اور امریکی قونصلر جنرل لاہور کارمیلا کے گھر میں پریس کانفرنس کی۔ انہوں نے پاکستانی میڈیا کے نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے تین پاکستانیوں کی ہلاکت پر افسوس کا اظہار کیا لیکن میرے سفارتی استثنیٰ پر اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹے۔ انہوں نے اپنی حکومت کے اس موقف کا اعادہ کیا کہ یہ کیس کورٹ میں نہیں جانا چاہیے تھا کیونکہ یہ سفارتی استثنیٰ کا سوال ہے اور ریمنڈ امریکی سفارت خانہ اسلام آباد کا رکن ہے۔ اس حوالے سے کاغذات میں سب کچھ کلیئر ہے۔ کیری نے تین ہلاک شدگان کے ورثا سے ہمدردی کا ظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ امریکی محکمہ انصاف اس واقعے کے حوالے اپنی تحقیقات کرے گا۔

جس وقت کیری پاکستان میں تھے، عین اسی وقت امریکی صدر اوبامہ بھی ایک پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے۔ ان سے پیشتر سوالات امریکی بجٹ اور عرب میں ہونے والی تبدیلیوں سے متعلق تھے لیکن پریس کانفرنس کے آخر میں ABC نیوز کے نمائندے جیک ٹیپر نے میرے متعلق سوال کر دیا۔

اوبامہ نے جواب دیا: ''مسٹر ڈیوس پاکستان میں ہمارے سفارت کار ہیں۔ ہمارے پاس بڑا سادہ سا اصول ہے کہ ویانا کنونشن کے تحت سفارت کاروں کو استثنیٰ حاصل ہے اور انہیں کسی عدالتی کاروائی کے زمرے میں نہیں لایا جا سکتا۔ یہ سادہ سی بات ہے اور پوری دنیا میں سفارت کاروں پر لاگو ہوتی ہے۔ ہم ان قوانین کا احترام کرتے ہیں اور باقی ملکوں سے بھی امید رکھتے ہیں کہ وہ بھی ایسا ہی کریں گے۔

اسی روز تحریک طالبان پاکستان نے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ اگر پاکستانی حکمرانوں نے مجھے امریکہ کے حوالے کیا تو وہ حکمرانوں کو نشانہ بنائیں گے۔ تحریک

Scanned with CamScanner

مالبان پاکستان کے ترجمان اعظم طارق کا یہ بھی کہنا تھا کہ اگر پاکستانی عدالتوں نے ڈیوس کو سزا نہ دی تو انہیں ہمارے حوالے کردیں، ہم قاتل ڈیوس کو خود سزا دیں گے۔

یہ مسئلہ اب اور زیادہ گرم اور گھمبیر ہو گیا تھا اور میری یہ بدقسمتی تھی کہ اس مسئلے کے حل کی گنجائش بھی کم سے کم ہوتی جا رہی تھی۔

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

اپنے بیٹے کے ساتھ

اہلیہ ربیکا کے ساتھ ترکی میں چھٹیاں مناتے ہوئے

Scanned with CamScanner

ابو حذیفہ

امریکی قونصل جنرل کارمیلا، ہیلری کلنٹن کے ساتھ، قونصل خانہ لاہور میں!

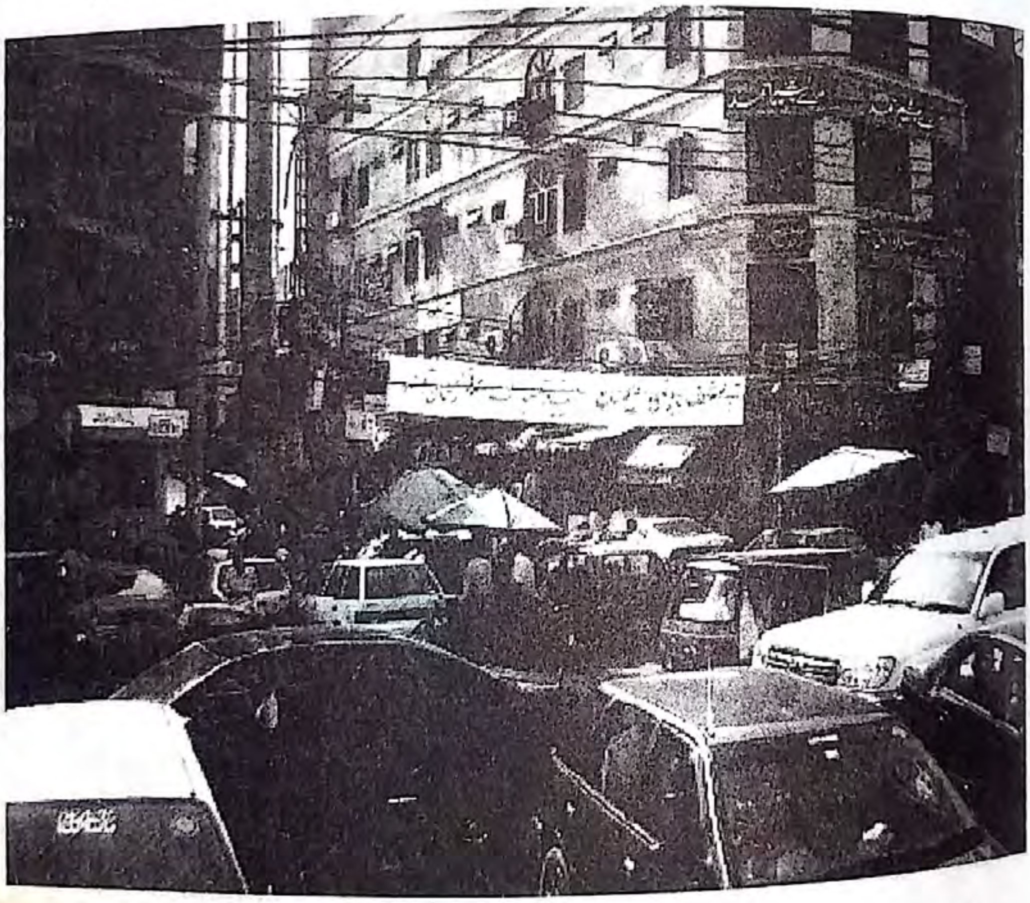

وکلا کا گڑھ، جہاں میرے وکیل کا دفتر بھی ہے۔

Scanned with CamScanner

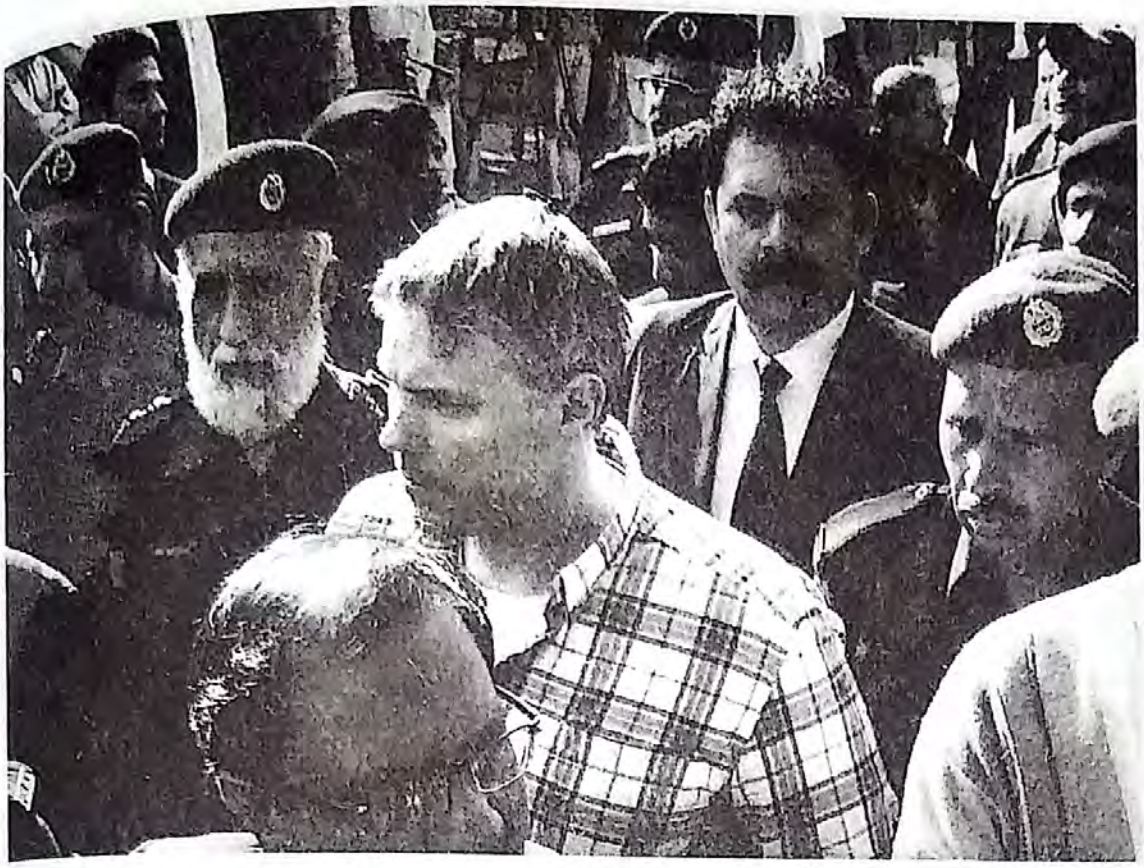

ریمنڈ ڈیوس عدالت میں پیشی کے موقع پر

افغانستان میں فوجی کنٹریکٹر کے طور پر کام کرتے ہوئے

Scanned with CamScanner

اہلیہ ربیکا کے ساتھ فلوریڈا میں!

ربیکا شمالی کیرولینا میں!

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

17

کوٹ لکھپت جیل، لاہور

(16 فروری، 21 واں دن)

''مجھے اس قید میں کافی دن ہو گئے ہیں۔ کیا ہو رہا ہے؟ مجھے یہاں سے نکالنے کے لیے آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟''

قونصلر جنرل کارمیلا مجھے ملنے آئیں تو میں نے کہا۔

''رے! ہم تمہیں یہاں سے نکالنے کے لیے جو کچھ ممکن ہو سکا ہے، کر رہے ہیں۔''

کارمیلا نے جواب دیا۔

کیا آپ سب میرے لیے نیا وکیل نہیں ڈھونڈ سکتے؟'' میں نے کہا۔

جب میرے وکیل ہاشم قادر نے پہلی پیشی کے بعد ہی کیس سے علیحدگی اختیار کر لی تو میرا کیس کمزور ہو گیا۔

''ہم اس پر کام کر رہے ہیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جلد بہتر ہو گا۔ ہم اس کیس پر بھرپور توجہ دے رہے ہیں۔ ہم اس کیس کو اعلیٰ حکومتی سطح پر ڈسکس کر رہے ہیں۔'' کارمیلا نے کہا۔

''ٹھیک ہے، لیکن کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ کیا، کیا جا رہا ہے؟ میں محسوس کر رہا ہوں کہ میں یہاں کے بارے میں بھول گیا ہوں۔''

Scanned with CamScanner

"اوہ نو! پلیز اس بارے میں انتامت سوچو۔ سینیٹر کیری یہاں تمہیں رہا کروانے کے لیے آئے تھے۔ ان کی پریس کانفرنس یہاں کے ہر چینل پر لائیو دکھائی گئی ہے۔ اس مسلئے کا حل..... میں اسے حکومتی سطح پر ڈسکس کر رہی ہوں۔"

"رے! تمہارا نام صدر نے پی ڈی بی میں لیا ہے۔"

اس بات نے میری توجہ حاصل کر لی۔ پی ڈی بی یعنی پریذیڈنٹ ڈیلی بریفنگ انتہائی خفیہ پیپر ہوتا ہے جو امریکی صدر کو روزانہ صبح اپ ڈیٹ کرنے کے لیے ڈائریکٹر آف نیشنل انٹیلی جنس صرف ان موضوعات پر دیتا ہے جو چیلنج انٹیلی جنس اور نیشنل سکیورٹی کے موضوع پر امریکی قوم کو درپیش ہوتے ہیں۔ ایک آئیڈیے کے طور پر بتاتا چلوں کہ یہ بریف کتنا اہم ہوتا ہے۔ جیسے 6 اگست 2001 کو امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کو یہ پی ڈی بی ملا کہ اسامہ بن لادن نے امریکہ کے خلاف حملوں کا اعلان کر دیا ہے۔

لیکن مجھے یہ نہیں پتہ تھا کہ پی ڈی بی میں میرا نام اچھے لفظوں میں آیا ہے یا برے لفظوں میں..... کیا ہوگا.... میں نے اندازہ لگایا۔

"اس مسئلے نے صدر کی کتنی توجہ حاصل کی، رے! صدر دراصل گذشتہ روز ایک پریس کانفرنس سے بھی خطاب کر رہے تھے۔ وہاں بھی یہ تذکرہ ہوا۔ پلیز، ہم پر بھروسہ رکھو، ہم تمہیں کسی طور پر نظر انداز نہیں کر رہے۔"

کارمیلا نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

قونصلیٹ سٹاف کے جانے کے بعد میں نے واک کی اور اپنے سیل میں آ کر لیٹ گیا۔

Scanned with CamScanner

18

کوٹ لکھپت جیل، لاہور

(17فروری، 22واں دن)

ایک دن میں نوٹ پیڈ پر کچھ لکھ رہا تھا کہ ایک گارڈ دوڑتا ہوا آیا اور اس نے میرے ہاتھ سے وہ پیڈ چھین لیا اور کہنے لگا۔

''یہ غیر قانونی ہے سر!

میں نے وہ پیڈ اسے دے دیا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ بہت عجیب تھا۔ میں سوچنے لگا کہ میری گھڑی اور فون بھی قبضے میں لیا گیا ہے اور مجھے دردناک چیکنگ کے عمل سے گزارا گیا ہے۔

اسی روز وہ گارڈ آیا اور مجھے وہ پیڈ دے کر کہنے لگا۔

''اٹس او کے سر! اس کی منظوری ہے۔''

گارڈ نے اسے وہیں ٹیبل پر رکھ دیا جہاں پنسلز پڑی تھیں۔ پھر کہنے لگا۔

لیکن میں ان تمام چیزوں کو چیک کرنا چاہوں گا۔ مجھے یہ چیک کرنے کی ضرورت ہوگی کہ کیا آپ کو ان کی اجازت ہے؟''

اس نے کچھ چیزوں کو وہاں سے اٹھا لیا اور دیکھنے لگا۔ اس نے میری کتابوں میں سے ایک کو پکڑا۔

Scanned with CamScanner

"یہ ٹھیک ہے، لیکن مجھے اس کتاب کے بارے میں معلوم نہیں، مجھے اسے لے جا کر یہ دیکھنا ہوگا کہ یہ اختیار آپ کو ہے یا نہیں۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"دیکھو، میں یہاں تمہارا کھیل دیکھ رہا ہوں۔ میں اس کا حصہ بننا نہیں چاہتا۔ اسے برباد کر دو، تم یہاں سے کچھ بھی لے سکتے ہو، مجھے اس کی پرواہ نہیں۔"

میں نے اپنی انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

لیکن یہ جان لو کہ اگر تم اسی طرح میری چیزیں اٹھاتے رہے تو میں واپسی کسی چیز کو قبول نہیں کروں گا۔ تم دینا بھی چاہو تو میں نہیں لوں گا۔ اس میں کھانا بھی شامل ہے۔ انڈر سٹینڈ....."

رات کو میرا کھانا تیار کرنے والا آدمی کھانا لے کر آیا تو میں نے شکریے کے ساتھ ٹرے واپس کر دی۔

"نہیں، شکریہ۔" میں نہیں کھانا چاہتا۔

جب اگلی صبح وہ ناشتے کے ساتھ آیا تو اس نے دیکھا کہ رات کا کھانا بھی ویسے ہی رکھا ہے اور اسے ہاتھ تک نہیں لگایا گیا۔ اس نے نئی ٹرے رکھی اور پرانی ٹرے اٹھا لی۔

دو تین دن ایسے ہی ہوتا رہا۔ اس کے بعد جیل کا ڈاکٹر میرے سیل میں آیا۔

"میں نے سنا ہے کہ تم نے کھانا چھوڑ دیا ہے؟ ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

میں نے خوشی سے اسے بتایا۔

"گارڈ میرے سیل میں آیا تھا۔ اس نے میری چیزیں اٹھا لیں اور کہا کہ ان کے لیے اجازت کی ضرورت ہے۔ حالانکہ مجھے ان چیزوں کی اجازت دی گئی ہے۔"

"اچھا!"

Scanned with CamScanner

"میں نے اس کے ساتھ کسی کھیل کا حصہ بننے سے انکار کر دیا ہے۔ اگر سب میری چیزیں چاہتے ہیں تو بہت بری بات ہے، جائیں اور لے لیں۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔"

"وہ انگلش بول سکتا تھا یا نہیں لیکن اسے سمجھ نہیں آئی کہ میں نے کیا کہا ہے۔

اس کے باوجود اُس نے انگریزی میں اچھی بات کی۔ اُس نے فرش پر خوراک کی ٹرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "میں تمہارے ساتھ کھاؤں گا۔ اِس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں کھانا نہیں چاہتا۔" میں نے اسے جواب دیا۔

"لیکن تم بھوکے ہو۔ تین دن ہو چکے ہیں۔"

"نہیں، میں ٹھیک ہوں۔ اگر تم بھوکے ہو تو کھالو۔"

"تم جانتے ہو کہ کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟ تم بہت تنہائی پسند ہو۔"

"تنہائی پسند"

"ہاں! جس دن سے تم یہاں ہو۔ بہت مشکل وقت گزار رہے ہو۔ ہمارے پاس یہاں تمام ملکوں کے جیسے فرانس، نیوزی لینڈ، انڈیا، زمبابوے کے قیدی بھی موجود ہیں۔ سب بہت دلچسپ ہیں۔ میں کچھ کا انتخاب کر دیتا ہوں، وہ تمہیں کمپنی دیا کریں گے۔"

ڈاکٹر یہ ثابت کرنا چاہ رہا تھا کہ وہ میرا بہت اچھا ساتھی ثابت ہو سکتا ہے، لیکن میں اپنا وقت کارڈز کھیل کر اور عالمی حالات حاضرہ جان کر گزار لیتا تھا۔ کیا پتہ کوئی مجھے کمپنی دینے کے لیے آتا اور مجھے سوتے ہوئے قتل کر دیتا۔

"نہیں، شکریہ۔ میں تنہائی میں رہنا پسند کرتا ہوں اور یہی میری ترجیح ہے۔ آپ کسی کو میرے ساتھ سیل میں شریک نہ کریں۔ مجھے کسی کی کمپنی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے خوراک

Scanned with CamScanner

کی بھی ضرورت نہیں۔ مجھے تم لوگوں سے کسی چیز کی ضروت نہیں ہے۔ انڈرسٹینڈ......"

میں نے اسے جو کچھ کہا تھا وہ اسے تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ وہ کافی دیر میرے پاس بیٹھا رہا۔ میں بھی خاموشی سے بیٹھا تھا۔ پھر وہ کھڑا ہوا اور میرے پاس آ کر کہنے لگا:

"کیا تم عافیہ صدیقی کو جانتے ہو؟"

میں عافیہ صدیقی کو پریس کے حوالے سے جانتا تھا۔ اس کا نام پریس میں آتا رہا تھا۔ اس کا تعلق القاعدہ سے تھا۔ وہ ایف بی آئی کی مطلوب ترین افراد کی فہرست میں شامل تھی۔ وہ کراچی میں پیدا ہوائی اور 1990 میں یونیورسٹی آف ہوسٹن میں داخلے کے بعد امریکہ چلی گئی۔ اس نے مانچسٹر انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے گریجویشن اور پھر پی ایچ ڈی کی۔ وہ اچھی مسلمان تھی لیکن بوسٹن مین قیام کے دوران اس کے اسلامی انتہاپسندوں سے رابطے ہوئے۔ ان میں سے ایک نیو یارک کا الکفامہاجر سنٹر تھا جس کے بارے میں بعد میں پتہ چلا کہ اس کا القاعدہ سے تعلق تھا۔

نائن الیوان کا حادثہ اس کی زندگی میں ایک تبدیلی لے کر آیا۔ جون 2002 میں عافیہ اور اس کے خاوند کو انٹرنیٹ کے ذریعے 10 ہزار ڈالر کے اندھیرے میں دیکھنے والے چشمے، باڈی آرمر اور اسی طرح کی دہشت گردوں کے استعمال میں آنے والی اشیا خریدنے کے الزام میں تفتیشی مراحل سے گزرنا پڑا۔ اس کے کچھ عرصے بعد اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی اور وہ پاکستان آ گئی۔ یہاں آ کر وہ ایف بی آئی کی مطلوب ترین افراد کی فہرست میں شامل ہو گئی۔

عافیہ 17 جولائی 2008 کو افغانستان سے گرفتار ہوئی۔ (یہ غلط بات ہے۔ عافیہ کو پاکستان سے جنرل پرویز مشرف کے دور میں گرفتار کر کے امریکیوں کے حوالے کیا گیا اور وہاں اس کی گرفتاری ظاہر کی گئی۔ مترجم) وہاں اس نے امریکی سارجنٹ سے رائفل چھین کر

Scanned with CamScanner

اس پر حملہ آوار ہونے کی کوشش کی۔اس کوشش میں اس سے گولی چل گئی جس سے دو افراد زخمی ہوئے۔امریکہ میں اس کا ٹرائل ہوا اور اسے 86 سال قید کی سزا سنائی گئی۔عافیہ نے امریکی فوجی اہلکاروں کو مارنے کے اپنے جرم سے انکار کیا۔

....

جیل سپرینڈنٹ نے اس وقت اچانک میرے سیل کا دورہ کیا جب میں قونصلیٹ سے آئے ہوئے سمیر سے گفتگو کر رہا تھا۔سمیر اور میں خوشگوار لمحات کو انجوائے کر رہے تھے۔میں سمیر کے بارے میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا جاب ٹائیٹل کیا ہے؟وہ سوشل ویلفیئر ہے یا کچھ اور....مجھے اس سے غرض نہیں تھی۔میں یہ جانتا تھا کہ اس کے ساتھ میری اچھی انڈر سٹینڈنگ ہے۔

سمیر اور جیل سپرینڈنٹ میں کافی دیر تک اردو میں گفتگو ہوتی رہی۔کچھ دیر بعد سمیر نے میری طرف رخ کیا اور مجھ سے پوچھا:

''تم نے کھانا کھانے سے انکار کیوں کیا ہے؟''

''یہ کوئی بڑی بات نہیں۔میں انہیں پیغام دینا چاہتا تھا۔یہ میرے پاس آتے ہیں، میری چیزوں کو اٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مجھے اس کی اجازت نہیں ہے۔یہ غیر قانونی ہے۔یہ سب مجھ پر دباؤ ڈالنے کی گیم ہے اور میں نے اس کھیل کا حصہ بننے سے انکار کر دیا ہے۔اگر انہیں میری کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ مجھ سے لے سکتے ہیں۔میں ان سے کوئی چیز نہیں چاہتا اور اس میں خوراک بھی شامل ہے۔یہ مجھے کھانے کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔یہ چاہتے کہ میں وہ کروں جو یہ چاہتے ہیں تو سن لیں میں ایسا نہیں کروں گا۔''

''لیکن رے، تمہیں کھانے کی ضرورت ہے۔یہ تم کس سمت جا رہے ہو۔''

سمیر نے اردو میں جیل سپرینڈنٹ سے بات شروع کر دی۔وہ واپس گیا اور اس کے بعد

Scanned with CamScanner

میری چیزوں کو کسی نے نہ چھیڑا اور وہ واپس کر دی گئیں، لیکن اس کے بعد جب گارڈ آیا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"اوکے! سمیر نے کہا۔ تمہیں چیزیں واپس مل گئی ہیں۔ اب تم کھانا شروع کر دو۔"

"اچھا، ٹھیک ہے۔"

سمیر نے مصنوعی انداز میں اپنے ہاتھوں کو فون بنا کر کہا؛

"روم سروس پلیز، کیا آپ ہمیں ٹی بونز اور بیئرز بھیج سکتے ہیں۔ میرا بہترین دوست رے اور میں آج اس سرزمین پر اپنی واپسی کا جشن منانا چاہتے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

19

کوٹ لکھپت جیل، لاہور

(19 فروری، 24 واں دن)

قونصلیٹ کے اہلکاروں کی مجھ سے روزانہ ملاقات ایک معمول کا حصہ تھی۔ قونصلیٹ سٹاف کو مجھ سے ملاقات کے لیے انتظار نہیں کرنا پڑتا تھا۔ ہم سب میٹنگ روم میں اکٹھے ہوتے اور معاملات ڈسکس کرتے۔ ایک دن میں ملاقات کے لیے جا رہا تھا۔ مجھے میٹنگ روم میں جانے کے لیے ایک بہت بڑے دروازے کے نیچے لگے ہوئے چھوٹے سے دروازے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ اتنا چھوٹا دروازہ تھا جیسا جیل کے مین گیٹ کے اندر ہوتا ہے۔ اس میں سے گزرنے کے لیے آپ کو جھکنا پڑتا ہے۔ میں جیسے ہی گزرنے کے لیے جھکا اور پھر قدم آگے بڑھاتے ہوئے اوپر ہوا تو میرا سر زور سے دروازے کے اوپر لگا۔ میرے سر میں درد کی لہر اٹھی اور آگے جاتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ میں نے انتہائی غصے اور زور سے دروازے کو بند کیا جس کی آواز چاروں طرف گونجی۔

میں میٹنگ روم میں داخل ہوا تو قونصلر جنرل کارمیلا، جیل سپرینڈنٹ اور ہوم ڈیپارٹمنٹ کے ایک افسر سے گفتگو کر رہی تھی۔ کارمیلا نے میری طرف دیکھا اور کہا:

"رے! کیا تم ٹھیک ہو؟"

Scanned with CamScanner

میں اس وقت کوئی اچھی حالت میں نہیں تھا۔ اگر ایمانداری سے کہوں تو کارمیلا نے واقعی مجھے اچھی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ میرے لیے بہت کچھ کر رہی تھی اور واقعی اس کی جاب بہت مشکل تھی۔

''ہاں، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے اسے جواب دیا۔

''دارصل آتے ہوئے میرا سر دروازے میں لگ گیا تھا۔ کچھ نہیں ہوا لیکن ایک برا واقعہ تھا۔''

''کیا تم کچھ آرام کرنا چاہو گے؟ تمہیں یہاں ہر وقت آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''میرے لیے پریشان مت ہوا کرو۔ میں کہیں نہیں جا رہا۔''

''اوہو! ارے! تم واقعی حفاظت کرنے والے ہو۔ ہم تمہاری مدد کر رہے ہیں۔ تم ہمیشہ ہمیں ہدایات دے دیتے ہو۔''

''میرے بارے میں پریشان مت ہوں۔ میں ٹھیک ہوں۔''

کارمیلا نے میری طرف ہاتھ بڑھائے اور پھر سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی۔

''تم نے کھانا شروع کر دیا ہے۔ یہ اچھی بات ہے۔'' پھر مجھ سے پوچھا۔

''اور کتنا سو رہے ہو؟''

''بہترین''

''ان سے سپیشل برتاؤ کیا جا رہا ہے۔'' جیل سپرینڈنٹ بتانے لگا۔ ''انہیں دوسرے قیدیوں سے بہتر ماحول دیا جا رہا ہے اور یہ سپیشل برتاؤ انہیں ہر وقت حاصل ہے لیکن میں انہیں کچھ باور کرانا چاہتا ہوں۔ یہ دوسروں سے مختلف نہیں ہے۔ یہاں ہمارے کچھ قانون اور ضابطے ہیں اور انہیں ان کو اپنانا چاہیے، انہیں بھی دوسرے قیدیوں کی طرح شلوار قمیض پہننی چاہیے۔''

Scanned with CamScanner

کارمیلا صاف اور کھری بات کرنے والی خاتون تھیں۔ اُس نے جیل سپرنٹنڈنٹ کو صاف کہہ دیا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ شلوار قمیض نہیں پہننا چاہتا تو یہ اس کی مرضی ہے۔ اس کی حیثیت دوسرے قیدیوں سے مختلف ہے۔ اسے یہاں سفارت کاروں کے بارے میں 1961 کے ویانا کنونشن قانون کے خلاف رکھا گیا ہے۔ مسٹر ڈیوس کو سفارتی استثنٰی حاصل ہے اور اسے اسلام آباد کے سفارت خانے کے حوالے کیا جانا چاہیے۔"

جیل سپریڈنٹ نے اس پر کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہم اپنی ضرورت کو ڈسکس کرتے ہوئے ان سے فنگر پرنٹ کا مطالبہ بھی کر رہے ہیں۔ ڈیوس یہاں قیدی ہیں اور ہمیں تمام قیدیوں کے فنگر پرنٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بنیادی معلومات بھی درکار ہوتی ہیں۔ یہ اس وقت سے ہمار مطالبہ رد کرتے چلے آ رہے ہیں۔ یہ ہمارے جیل قیدیوں کے قوانین کی سنگین خلاف ورزی ہے۔"

"میں اس مسئلے کی اہمیت کو سمجھتی ہوں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ اس مسئلے کو حل کروا دوں گی۔ مجھے حکومت کے جواب کا انتظار ہے کہ وہ اس معاملے کی مخصوص حالت کی وجہ سے یہ معلومات فراہم کرنا چاہتی ہے یا نہیں....."

اس ملاقات کے بعد بھی مجھ سے فنگر پرنٹ اور کچھ معلومات دینے کا مطالبہ کیا جاتا رہا۔ میں اس مطالبے کو رد کرتا رہا۔ مجھے پتہ تھا کہ فنگر پرنٹ کا مطالبہ جرائم پیشہ افراد سے کیا جاتا ہے اور میں کوئی مجرم تو نہیں تھا۔ مجھے یہ بات پسند نہیں تھی کہ کوئی میرے رہائشی ایڈریس اور میرے فیملی ممبرز تک رسائی حاصل کرے۔ اگرچہ میرے والدین وفات پا چکے تھے لیکن میرا بھائی، بہن، بیوی اور بیٹا تو تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان میں کوئی ان کے

Scanned with CamScanner

بارے میں جانے کہ وہ کہاں رہتے ہیں ہیں۔اس معلومات کو کوئی بھی استعمال کر سکتا تھا۔

جیسے ہی جیل سپریڈنٹ اور ہوم ڈیپارٹمنٹ کا آدمی کمرے سے باہر گئے۔ میں نے کارمیلا سے پوچھا۔

''میں نے جو آخری ملاقات میں باتیں کی تھیں،اس کے بعد کیسا جارہا ہے سب کچھ، کیا کچھ بہتری ہوئی؟''

''ہم ہر وقت اسی مسئلہ پر کام کرر ہے ہیں۔''

''میں سوچنا شروع کرر ہا ہوں کہ میں کبھی بھی یہاں سے باہر نہیں نکل سکتا۔''

''رے! ہم پر یقین کرو۔ بہت سے معاملات ایسے ہیں جو تم نہیں جانتے۔اس معاملے پر بہت اونچے لیول پر گفتگو ہو رہی ہے۔کیری کے دورے کے بعد بال گردش میں ہے۔دونوں طرف سے گفتگو ہو رہی ہے۔یہ بہت مشکل کیس ہے۔اس کے بہت سے پارٹس ہیں۔لیکن ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ تمہیں یہاں سے باہر نکالیں۔

اگر پاکستانی حکومت ہمارے بات ماننے سے پھر بھی انکار کر دیتی ہے تو ہمارے پاس بہت سے آپشنز ہیں جو فی الحال تمہیں نہیں بتا سکتی۔ہم یہ بھی سوچ رہے ہیں کہ کیری لوگر بل کے تحت پاکستان کو دی جانے والی 500 ملین ڈالر کی امداد روک دی جائے۔''

کارمیلا جاتے ہوئے مجھ سے گلے ملی اور میرے کان میں کہا:

''انہیں فنگر پرنٹ کسی صورت نہیں دینے۔اس کے لیے چاہے تمہیں کچھ بھی کرنا پڑا۔اگر یہ تم پر تشدد کریں تو جو تم بہتر سمجھتے ہو،وہ کرو،کسی کی پرواہ مت کرنا۔''

کارمیلا نے کے جانے اور اس کی جیل سپرینڈنٹ سے سخت گفتگو کے بعد کسی نے مجھے دباؤ میں لانے کی کوشش نہیں کی۔ کارمیلا کی بات میری سمجھ میں آرہی تھی کہ پاکستان کو امداد کی بندش اسے فیصلے تبدیل کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ پاکستان کی معیشت کا زیادہ تر

Scanned with CamScanner

انحصار امداد پر ہی تھا۔ ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کے قرضوں کے بغیر پاکستانی معیشت نہیں چل سکتی۔

دوپہر کے بعد دو گارڈز آئے اور مجھے اٹھنے کو کہا تو میں نے انکار کر دیا۔

''کیا کوئی اور انٹرویو....'' میں نے پوچھا۔

نہیں، ہم تمھارے فنگر پرنٹ لینے آئے ہیں۔

''آئی ایم سوری۔ میں فنگر پرنٹ نہیں دے سکتا۔'' میں نے اپنا ذہن بنا لیا تھا اور سوچ لیا تھا کہ اگر انہوں نے میرے فنگر پرنٹ لینے کی کوشش کی تو وہ اپنے ہاتھ توڑنے سے مجھے نہیں روک سکیں گے۔

میں عام طور پر خواب نہیں دیکھتا، لیکن میں نے اس رات خواب دیکھا کہ گارڈز نے حکم کے مطابق میرے فنگر پرنٹ حاصل کرنے کے لیے میرے ہاتھوں کو توڑ دیا۔ میں اپنے ہاتھوں پر نشان دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میں قید سے رہا ہو گیا ہوں اور میرے دونوں ہاتھ میرے سینے پر ہیں۔ ہوائی جہاز کی سواری کے بعد پیچھے سے ایک آواز آئی۔

''ہیلو بھائی! تم باہر آ گئے ہو۔ بہت خوشی کی بات ہے۔ مبارک ہو۔''

میں نے اچانک کہا:

میرے ہاتھ..... میرے ہاتھ ......اور پھر میری آنکھ کھل گئی۔

Scanned with CamScanner

20

کوٹ لکھپت جیل، لاہور

(20 فروری، 25واں دن)

اگر آپ مجھ سے یہ پوچھیں کہ جیل میں قید کے دوران مجھ پر تشدد کیا گیا تو میں کہوں گا، نہیں۔ تشدد دراصل اذیت دینے کا نام ہے۔ مجھے سپیشل فورس کی ٹریننگ کے دوران ایسے کئی مراحل سے گزرنا پڑا۔ میں اس وقت تشدد کی بہت سی تعریفیں کرسکتا ہوں۔ انسٹرکٹر ہمیں لکڑی کے ایک باکس میں بند کر کے پانی میں پھینک دیتے۔ اس باکس کو پیٹا جاتا۔ پھر ہمارے ہاتھ باندھ کر پانی میں پھینک دیا جاتا۔ ہمیں اس بات کی اجازت نہیں ہوتی کہ ہم تیر سکیں۔ ہم اپنے ہاتھ کندھے سے باہر نہیں نکال سکتے تھے۔ اس کے علاوہ بے شمار ایسے مراحل جن کے ذریعے ہمیں سخت سے سخت حالات برداشت کرنے کی تربیت دی جاتی تھی۔

امریکی فوجیوں کا اس ساری ٹریننگ کا مقصد یہ تھا کہ اگر فوجی بیرون ملک کہیں پکڑے جائیں تو وہ ہر قسم کا تشدد برداشت کر سکیں۔ مجھے تربیت کے دوران تشدد برداشت کرنے کے لئے جو کچھ سکھایا گیا تھا وہ یہاں ہونے والے تشدد سے کہیں زیادہ بدتر تھا۔

اس ٹریننگ کے برعکس مجھے کوٹ لکھپت جیل میں کبھی تشدد کا نشانہ نہیں بنایا گیا۔ مجھے کبھی مارا نہیں گیا۔ مجھ پر کسی قسم کا سٹریس نہیں ڈالا گیا۔ مجھے کبھی پانی میں نہیں دھکیلا گیا۔ کبھی مجھ پر ننگا کر کے ٹھنڈا یا گرم پانی نہیں ڈلا گیا۔ قید کے دوران میری جلد تک کو کوئی

Scanned with CamScanner

نقصان نہیں پہنچا۔

لیکن مجھے انٹروگیشن کے طویل مراحل سے گزرنا پڑا۔ یہ میرے لیے ایسے ہی تھا کہ مجھ پر کبھی ٹھنڈا اور کبھی گرم پانی ڈالا جا رہا ہے۔ مجھے ہر وقت ایسا محسوس ہوتا کہ میں باتھ ٹب میں بیٹھا ہوں۔ ایک ایسی لائٹ جو میرے سر کے اوپر 24 گھنٹے جلتی رہتی تھی، مجھے تکلیف دیتی تھی۔ مجھے گارڈز اور افسران سے ملاقاتوں کے لیے مجبور کیا جاتا رہا۔ مجھے آرام کرنے سے روکا گیا۔ مجھے مجبور کیا گیا کہ میں شور والا میوزک سنوں۔ مجھے گھڑی سے محروم کیا گیا تا کہ مجھے ٹائم کا پتہ نہ چل سکے۔ (کارمیلا نے حکام کو گھڑی دینے کو کہا تھا لیکن نہیں دی گئی) مجھے روزانہ چکن اور چاول کھانے پر مجبور کیا جاتا۔ یہ سب میرے لیے ایک طرح کے تشدد کے برابر ہی تھا۔

میری گرفتاری پوری دنیا کے میڈیا کے لیے ایک بڑی خبر تھی۔ جیل میں اگر میرے ساتھ برا سلوک یا تشدد کیا جاتا تو اس سے حکومت پاکستان کو ہی نقصان پہنچتا کیونکہ میرے پاس سفارتی پاسپورٹ تھا اور مجھے استثنیٰ بھی حاصل تھا۔ مجھ پر تشدد کی صورت میں پاک امریکہ تعلقات متاثر ہوتے، وہاں دوسرے ملک بھی یہ سوچتے کہ ایک سفارت کار پر تشدد کیا جا رہا ہے جسے استثنیٰ حاصل ہے۔ پاکستان دیگر ممالک کی طرف سے اس طرح کے دباؤ کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

میرے اعتماد کے مطابق اگلی دفعہ جب قونصلیٹ کی ٹیم مجھ سے ملنے آئی تو وہ اپنے ساتھ ایک ماہر وکیل کو لائی جس کی مجھے عدالت میں پیشی کے دوران ضرورت تھی۔

میرے کیس میں طوالت کی وجہ بھی یہی تھی۔ جب میرے کیس کی بابت ڈیپارٹمنٹ آف جسٹس کو پتہ چلا تو یہ بات یقینی تھی کہ مجھے ان کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس وقت پورے پاکستان میں ڈیپارٹمنٹ آف جسٹس کا صرف ایک وکیل تھا۔ یہ ایک بڑی کمزوری تھی جو

Scanned with CamScanner

میرے کیس میں حائل تھی۔

پیٹر سٹریسر پاکستان میں تربیت کے لیے آئے تھے اور ان کی ذمہ داری مقامی پراسیکیوٹرز کو ٹریننگ دینا تھی، لیکن میرا کیس ان کے لیے بھی آسان نہیں تھا۔

27 جنوری کے بعد سٹریسر کی سرکاری ذمی داریاں معطل کر دی گئیں اور کی ان بنیادی ذمہ داری میرا کیس قرار پایا۔ سٹریسر کا کام میرے کیس میں مقامی پراسیکیوٹرز کی مدد کرنا تھا۔ سٹریسر کی میرے کیس میں معاونت کے بعد پاکستان کے تمام چوٹی کے وکلا یہ امید لگا کر بیٹھ گئے کہ امریکی سفارت خانے کی طرف سے میری وکالت کے لیے انہیں ہائر کیا جائے گا۔ اس کا فائدہ وہ جانتے تھے۔

سٹریسر نے بعد میں کہا کہ ”یہ ناقابل یقین حد تک مشکل تھا۔ یہ آسان لگتا ہے۔ آپ کسی وکیل کو تلاش کریں لیکن لاہور میں کوئی وکیل بھی ایسا نہیں تھا جو اس معاملے کو براہ راست لیتا۔ وہ سب ڈرتے تھے کہ اگر ان کا نام ڈائریکٹ آیا تو وہ مارے جائیں گے اور یہ ایک مناسب خوف تھا کیونکہ پاکستان میں اس طرح کئی وکلا ہلاک ہو چکے تھے۔ اگر آپ کسی بھی وجہ سے بنیاد پرستوں اور دہشت گردوں کو ناراض کرتے ہیں تو آپ مار دیئے جاتے ہیں۔ وکلا پر ایک حقیقت پسندانہ خوف تھا۔

یہ خوف اس وقت حقیقت بن گیا جب میرے کیس کے پہلے وکیل ہاشم قادر نے کیس شروع ہونے کے بعد چند ہی دنوں میں اچانک مجھ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ سٹریسر نے اگلے کئی روز ایسے وکلا کو تلاش کرنے میں گزارے جو میرا عدالت میں دفاع کر سکیں۔ پنجاب کے سابق پراسیکوٹر جنرل زاہد حسین بخاری کی مشاورت سے انہوں نے بے شمار وکلا سے مشورے کیے جو میرا کیس لڑ سکتے تھے لیکن وہ کسی کو بھی ہائر نہ کر سکے۔ یہ کیس اس وقت ایک ہائی پروفائل کیس بن چکا تھا۔ انہوں نے پہلے اور دوسرے درجے کے وکلا

سے بات کی لیکن اُن سب کا ایک ہی جواب تھا:

''ہم یہ نہیں کرنا چاہتے۔''

انتہا پسندوں کی دھمکیوں کے باعث کام کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ پہلے درجے کے وکیل جو اس کیس میں دلچسپی رکھتے تھے، تین تین وکلا کے پینل کا حصہ بننے پر اصرار کرتے تھے۔ کوئی بھی وکیل اسے اکیلے لینا نہیں چاہتا تھا۔ بالا آخر سٹریسر کی کوششوں کے بعد وہ وکلا کا ایک پینل بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ تین بہترین وکلا میرے کیس کی پیروی پر رضامند تھے۔ وکلا نے قونصل خانے میں بیٹھ کر سٹریسر کے ساتھ ایک گھنٹے میٹنگ کی اور میرے کیس کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ لیکن جب معاہدے کا وقت آیا تو ایک وکیل کے پن نے ایگریمنٹ پر چلنے سے انکار کر دیا۔ اس وکیل نے سٹریسر کی طرف دیکھا اور اسے کہا۔

''آئی ایم سوری۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

سٹریسر نے بعد میں کوشش کی اور اسے امید تھی کہ وہ کسی بھی مقامی وکیل کو 20 ہزار ڈالر فیس دے کر راضی کر لے گا لیکن سٹریسر کے انٹرویو کے بعد کوئی بھی وکیل اتنے تھوڑے پیسوں کے عوض اپنی زندگی داؤ پر لگانے کے لیے تیار نہ ہوا۔

آخر میں جھنجھلا کر سٹریسر اس آدمی کے پاس گیا جس نے اُسے وکلا کی کمپوز شدہ فہرست دے کر اُن سے رابطہ کرنے کو کہا تھا۔

''آپ اسے وکیل کیوں نہیں کرتے۔''

''لیکن اس کی فیس...... بخاری نے ایک اور بڑے وکیل کا نام لیا۔

سٹریسر نے اندازہ لگایا اور اپنی فیس کی آفر ایک لاکھ ڈالر کر دی۔

''او کے۔ میں ایک لاکھ ڈالر کے عوض یہ کیس لے لوں گا لیکن آپ کو میری لائف انشورنس پالیسی لینا ہوگی۔'' اس بڑے وکیل نے کہا۔

Scanned with CamScanner

"لیکن ایک لاکھ ڈالر فیس سے آپ اپنی لائف انشورنس پالیسی لے سکتے ہیں۔"
سٹریسر نے جواب دیا۔

....

کارمیلا تین ہفتوں سے میرے وکلا کی تلاش میں تھی اور وہ اس میں ناکام رہی تھی۔

لہذا جب اس نے اپنی نئی قانونی ٹیم سے مجھے متعارف کرایا تو اُس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ جب انہوں نے وضاحت کی کہ بخاری مقامی قونصلر کے طور پر کام کرے گا، جبکہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے لیگل ایڈوائزر پال معاونت کریں گے تو مجھے خوشی ہوئی۔

"میں یہ چاہتا ہوں کہ جب میں یہاں ہوں تو تمہیں باہر ہونا چاہیے۔ میں اس وقت تک پاکستان سے نہیں جاؤں گا جب تک تمہیں رہا نہ کروا لوں۔" پال نے مجھے یقین دہانی کروائی۔

"شکریہ۔" میں نے اس کے خیالات کو سراہا۔

"اس کے علاوہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے کیس کو بہت سنجیدگی سے لیا جا رہا ہے اور یہ حکومتی سطح پر پر ڈسکس ہو رہا ہے۔"

"جی ہاں! میں نے جواب دیا۔ اعلیٰ ترین حکومتی سطح صرف ضابطے کی حد تک ہے۔"
میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"پتہ نہیں تم کیوں یقین نہیں کر رہے۔ میں نے کہا کہ اعلیٰ ترین حکومتی سطح پر.... صدر نے خود تمہارا نام لیا ہے۔"

وہ کارمیلا کے پاس گیا اور اس سے پوچھا: "وہ اپنی دیکھ بھال کیوں نہیں کرتا؟"

"مجھے لگتا ہے کہ یہ یہاں بہت تنگ ہے۔"

"کیا یہ صحیح ہے؟" پال نے مجھ سے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

"جی سر۔"

مجھے یہ سن کر دھچکا لگا کہ اگر صدر یہ چاہتے کہ مجھے رہا ہونا چاہیے تو میں یہاں کیوں ہوں؟ مجھے نہیں پتہ تھا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے؟ لیکن اگر وہ کر سکتے تو کر چکے ہوتے۔ تو کیا مجھے یہاں لمبے عرصے کے لیے رہنا ہوگا۔

"رے! تم غلط سمت میں سوچ رہے ہو۔" پال نے کہا۔

"یہ حقیقت ہے کہ طویل عرصہ اصل میں اچھا ہے۔ ہم جو بھی تاخیر کر رہے ہیں، بہتری کے لیے کر رہے ہیں۔ مسٹر بخاری نے پتہ چلایا ہے کہ تم نے جن دو لڑکوں کو گولی ماری تھی، انہیں پچاس بار پہلے بھی گرفتار کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پولیس نے لاشوں کو تلاشی لی تو انہیں کچھ سیل فون اور کریڈٹ کارڈ مل گئے۔ اُن لوگوں نے اسی دن دوسرے موٹر سائیکلوں سے بھی چوری کی تھی۔ یہ حقائق ہیں لیکن ان میں سے کچھ بھی پولیس کی طرف سے پیش کئے گئے چالان میں نہیں ہے۔ ان مناظر کے پیچھے بھی بہت کچھ ہے جو آپ نہیں جانتے ہیں۔"

میں نے کارمیلا کی طرف دیکھتے ہوئے اسے زور سے پکارتے ہوئے کہا۔

"ہائے کارمیلا! تم جانتی ہو، عافیہ صدیقی کون ہے؟"

اس کے اپنے چہرے پر میرا یہ سوال سنتے ہی عجیب طرح کے مسکراہٹ والے تاثرات آئے کیونکہ عافیہ صدیقی پاکستان میں بہت مشہور تھیں۔

اس نے کہا: "ہاں۔" اتنی ہچکچاہٹ سے جواب ایک سوال کی طرح لگ رہا تھا۔

کمرے میں موجود تمام افراد نے اپنی توجہ میری طرف کر لی۔ کچھ لوگ اپنی سیٹوں پر چوکنے ہو کر بیٹھ گئے۔

"جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ عافیہ صدیقی امریکہ میں قید ہیں اور مجھے یہ بتایا گیا ہے

Scanned with CamScanner

کہ جیسے ہی وہ آزاد ہو جائیں گی، یہاں میں آزاد ہو جاؤں گا۔ایسا لگتا ہے جیسے میں چند دنوں میں یہاں سے نکل سکتا ہوں۔کیا اس چیز کی بابت بات کی جا رہی ہے؟''

''ہاں! میرا یقین ہے کہ یہ معاملہ ڈسکس ہوا ہے۔''

میں نے اپنی بات روکی اور یہ دیکھنے کے بعد کہ کمرے میں سپرینڈنٹ جیل اور ہوم ڈیپارٹمنٹ کا اہلکار نہیں ہے، دوبارہ کہا۔

''یہ کام نہیں کرنا۔ مجھے یہاں سے نکالنے کے لیے ایک مجرم دہشت گرد کو رہا نہیں کرنا۔میرے بڑے کندھے ہیں۔میں اس بوجھ کو برداشت کر سکتا ہوں۔میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔میری بات سن رہے ہو؟''

کارمیلا نے مسکراتے ہوئے اشارہ دیا۔

''میں سمجھتا ہوں، میں اس بات کا یقین کروں کہ پیغام مل گیا ہے۔''

جیل سپرینڈنٹ اور ہوم ڈپارٹمنٹ کے اہلکار کے ذریعے مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ اس منصوبے کو جیل کے ڈاکٹر کے ذریعے مجھ تک پہنچانے کی کوشش کی گئی تھی۔

Scanned with CamScanner

21

ہائیلینڈ رانچ، کلوروڈو

(20 فروری، 25واں دن)

ریمنڈ ڈیوس کو گرفتار ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا اور مجھے یہ خوف لگنے لگا تھا کہ شائد وہ اب واپس نہ آسکے۔ شادی کے بعد وہ بہت تھوڑا عرصہ گھر رہا تھا اور یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ہمارے بیچ کبھی کوئی رومانوی تعلق رہا، بلکہ ایک کاروباری شراکت دار کی طرح ہم ایک دوسرے کی ہر ممکن مدد کرتے تا کہ ایک دوسرے کیلیئے محبت کی بجائے اطمینان کا باعث بن سکیں، حتیٰ کہ جب وہ گھر میں تھا تو ایسا لگتا تھا کہ وہ گھر میں نہیں ہے، وہ جسمانی طور پر تو گھر میں تھا لیکن اس کا ذہن ابھی بھی کہیں اور تھا۔

میں نے اسے ان ہفتوں میں بمشکل ہی دیکھا جب وہ اپنے آخری مشن پر تعیناتی کیلیئے پاکستان جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ میرے والد کینسر سے مر رہے تھے اور میں ریمنڈ کو اپنے بیٹے کے پاس چھوڑ کر ایک ہفتے کیلیئے والد کے پاس چلی گئی تا کہ اپنی بہنوں کے ساتھ مل کر والد کو ہسپتال میں داخل کرا سکوں اور ان کے گھر کو صاف کر سکیں۔ میں اتوار کو گھر واپس آئی اور اگلے ہی دن ریمنڈ پاکستان چلا گیا۔

جب ریمنڈ قید تھا، اس کے سپروائزر ان تقریباً ہر روز مجھے فون کرتے اور جاری صورتحال کے بارے میں آگاہ کرتے۔ اگرچہ ایک بڑے عہدے پر ہونے کی وجہ سے وہ

Scanned with CamScanner

بہت معروف ہوتے تھے تاہم اس کے باوجود وہ میرے ساتھ بات کرنے کیلئے وقت نکالتے، وہ میری زندگی میں دلچسپی لیتے تھے اور اس عرصہ کے دوران بہت مہربان رہے۔ وہ میرے بچے کے بارے میں پوچھتے رہتے، دن کیسے گزرا، مجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں حتی کہ انہوں نے مجھے ویلنٹائن ڈے پر کال کی، تین ہفتوں بعد میری اور ریمنڈ کی شادی کی سالگرہ پر ہم نے ہر ایک چیز اور معاملے پر بات کی، کبھی کبھار ٹیلیفون پر گفتگو ایک گھنٹے سے بھی زیادہ جاری رہتی۔

Scanned with CamScanner

22

کوٹ لکھپت جیل، لاہور

(20 فروری، 25 واں دن)

میں سی آئی اے کا ایجنٹ تھا، یہ ان جھوٹوں میں سے ایک تھا جو میڈیا نے میرے خلاف پھیلائے تھے۔ پاکستانی میڈیا میرے بارے میں خصوصاً اس حوالے سے بڑا سخت خطاوار تھا۔ پاکستانی میڈیا نے میرے بارے میں ہر طرح کی پاگل پن پر مبنی کہانیاں شائع کیں کہ میں پاکستان میں کیا کر رہا تھا۔ یہاں تک کہا گیا کہ میری ذاتی افغان آرمی تھی اور میں طالبان کے ساتھ مل کر پاکستانی حکومت کو نیچا دکھانے کیلئے کام کر رہا تھا۔ میں اسلام آباد میں سی آئی اے کا سٹیشن چیف تھا اور میں نے ذاتی طور پر اسامہ بن لادن کو شکار کرنا تھا اور اسی طرح کی کئی کہانیاں بنائی گئیں، جن سے میرا خاندان اور دوست اپنے سر پیٹنا شروع ہو گئے۔

یہ خبر کہ میں جاسوس تھا، میری بیوی ربیکا کیلئے مشکل ترین تھی کیونکہ اسے ہی اس خبر کے ممکنہ نتائج بھگتنا تھے۔ جب لوگ دلچسپ مگر غلط اور بیزار مگر سچی کہانی سنتے ہیں تو عموماً وہ جھوٹی کہانی آگے پھیلانے میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔

لفظوں کے یہ سارے سکینڈلز مجھ تک قونصلیٹ کے لوگوں کے ذریعے پہنچتے۔ اگلی دفعہ جب وہ مجھ سے ملنے کے لیے آئے تو ڈال مجھے ایک طرف لے گیا اور سرگوشی سے

Scanned with CamScanner

میرے کان میں کہنے لگا۔

"یہ کہانی تمام میڈیا میں پھیلی ہوئی ہے کہ تم سی آئی اے کے ایجنٹ ہو۔"

"اچھا۔اس کہانی کا مثبت پہلو تلاش کرو۔" میں نے اسے کہا۔

آخر کار اس کے بعد کسی نے مجھ سے اس بارے میں گفتگو نہیں کی۔

Scanned with CamScanner

23

مسقط، عمان

(23 فروری، 28 واں دن)

مجھے اکثر بتایا گیا مجھے باہر نکالنا امریکی حکومت کی اولین ترجیح ہے لیکن مجھے کچھ خبر نہ تھی کہ اصل میں پس پردہ کیا ہو رہا ہے۔ بہت کم لوگوں نے مجھے رہا کرانے کیلئے کوششیں کیں، امریکی حکومت نے دوطرفہ پالیسی اختیار کی، ایک وہ جو آسانی سے دیکھی جا سکتی تھی اور دوسری وہ جو خفیہ تھی۔ پاکستان میں اس وقت کے امریکی سفیر منٹر نے رہائی کے سالوں بعد کہا:

"ہم اس پالیسی کو پانی کے اوپر اور پانی کے نیچے کے طور پر بیان کر سکتے ہیں، پانی کے اوپر ہم احتجاج کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ پاکستان کو ڈیوس کو عدالت میں لے جانے کا اختیار نہیں ہے اور پانی کے نیچے ہم ڈیوس کی رہائی کیلئے مذاکرات کر رہے تھے۔"

اس کے علاوہ دو مزید کرداروں نے پانی کے نیچے کام کیا۔ ان میں ایک سی آئی اے کے ڈائریکٹر لیون پنیٹا اور دوسرے ڈی جی آئی ایس آئی احمد شجاع پاشا تھے۔ اگرچہ سی آئی اے چیف پنیٹا واشنگٹن کے ایک طویل عرصہ تک راز دار رہے۔ وہ 97-1994 تک امریکی صدر کلنٹن کے چیف آف سٹاف رہے۔ تاہم جب صدر اوباما نے انہیں 2009 میں سی آئی اے کا سربراہ مقرر کیا تو وہ سب کیلئے حیران کن تھا۔ پینٹا نے

Scanned with CamScanner

1960 میں صرف دو سال فوج میں گزارے۔ اس لیے وہ فوج اور انٹیلی جنس کے بارے میں بہت کم تجربہ رکھتے تھے۔

دوسری طرف ان کے مدمقابل احمد شجاع پاشا تھے۔ پاشا نے 1974 میں فوج میں شمولیت اختیار کی اور ترقی کرتے ہوئے مختلف مناصب پر فائز ہوئے۔ 2006 میں وہ ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشنز مقرر ہوئے۔ دو سال بعد آرمی چیف جنرل اشفاق پرویز کیانی نے انہیں ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی بنا دیا۔ جنرل پاشا کے ڈی جی آئی ایس آئی بننے کے صرف دو ماہ بعد ممبئی میں حملہ ہو گیا جس میں 164 افراد ہلاک ہوئے۔

آئی ایس آئی اور سی آئی اے کے بیچ کئی سالوں سے چلی آ رہی کشیدگی میں میرے معاملے نے اور اضافہ کر دیا۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ جان کیری کے 15 فروری کو پاکستان آنے سے پہلے جنرل پاشا امریکہ گئے تھے اور سی آئی اے چیف پنیٹا سے صاف صاف پوچھا تھا:

کیا ریمنڈ نے سی آئی اے کیلئے کام کرتا تھا؟"

پنیٹا نے جواب میں نہیں کہا اور بتایا کہ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اس معاملے کو ڈیل کر رہا ہے، نہ کہ سی آئی اے۔

جنرل پاشا اپنے ہم منصب پنیٹا کے اس جواب سے مزید غصے میں آ گئے۔ پھر منٹر نے وائٹ ہاؤس اور سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے حکام کے ساتھ مل کر میری ملازمت کی نوعیت کی وضاحت کی، جو جنرل پاشا کو سمجھ میں آ گئی۔ جنرل پاشا بھی پاکستانی صدر اور وزیر اعظم کی طرح اس وقت تک مجھے جیل میں رکھنے کے حق میں تھے جب تک کہ اس پریشان کن مسئلے کا حل نہ نکل آئے۔ لیون پنیٹا نے امریکہ میں پاکستانی سفیر حسین حقانی کے ساتھ 21 فروری کو ملاقات کی اور انہیں مجھے جیل سے نکالنے کیلئے مدد کا کہا۔ حقانی کو

Scanned with CamScanner

عموماً پرو امریکہ کے طور پر دیکھا جاتا ہے تاہم اس معاملے میں انہوں نے زیادہ تعاون نہیں کیا۔

اس کے دو دن بعد دونوں جانب کی افواج کے اعلیٰ فوجی افسران عمان کے ساحل پر ایک لگژری سیرہ گاہ میں ملے۔ یہ انتہائی خفیہ ملاقات میرے گرفتار ہونے سے کئی مہینے پہلے افغانستان میں جنگ پر بات چیت کرنے کیلئے طے کی گئی تھی لیکن زیادہ وقت میرے مسئلے کو ڈسکس کرنے میں لگا۔ دونوں اطراف سے درست باتوں پر ملاقات ختم ہوئی۔ چیئر مین جوائنٹ چیفس آف سٹاف ایڈمرل مائیک مولن نے رپورٹرز کے سامنے کہا کہ میں اس مشکل صورتحال میں جنرل کیانی کا وقت دینے اور مذاکرات جاری رکھنے کا موقع دینے پر بہت مشکور ہوں۔

جنرل کیانی نے کہا کہ مجھے امریکی افسران کے ساتھ ملاقات پر خوشی ہے جس میں انتہا پسندی کے خلاف ہماری طرف سے کی جانیوالی کوششوں اور میری سوچ کہ کیسے دونوں بہتر طور پر تعاون کر سکتے ہیں، پر تبادلہ خیال کیا گیا۔

یہ تعلقات دونوں ملکوں کیلئے اگرچہ امتحان تھے تاہم مولن اور کیانی ملاقات کے بعد معاملہ حل ہونے کے امکانات بڑھ گئے تھے۔ اگرچہ اس معاملے پر پیش رفت ہو رہی تھی تاہم کئی لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی رفتار بہت سست ہے، معاملہ لٹکنے سے لوگوں میں ہیجانی کیفیت بڑھ رہی تھی، واشنگٹن سے لوگوں نے مجھے پیغامات بھیجے کہ جنرل کیانی اور جنرل پاشا میرے معاملے کو لمبا کرنا چاہتے ہیں، وہاں کیا ہو رہا ہے، اور ہم کیا کرنے جا رہے ہیں اور میں انہیں کہتا کہ ہمیں صبر کے ساتھ کام لینا چاہیے۔ ہمارے پاس زیادہ آپشنز نہیں ہیں۔

جون 2010 میں سی آئی اے کو اسامہ بن لادن کو پکڑنے کے سلسلے میں بڑی کامیابی ملی۔ سی آئی اے کو ابو احمد الخیری اور ابراہیم سعید احمد کے کچھ پیغامات ملے جن کے بارے

Scanned with CamScanner

میں پہلے سے یہ شبہ تھا کہ وہ اسامہ بن لادن کے قریبی پیغام رساں ہیں۔ 2001 میں اسامہ کے ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے یہ سی آئی اے کی سب سے بری کامیابی تھی جب وہ افغانستان میں تورہ بورہ سے فرار ہو گیا تھا۔

دو ماہ کی تلاش کے بعد سی آئی اے ایجنٹ احمد کا تعاقب کرتے ہوئے ایبٹ آباد میں بلال ٹاؤن پہنچ گئے۔ اسلام آباد سے 40 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع شہر ایبٹ آباد ایک ہل اسٹیشن اور سیاحوں کی آمد و رفت کے لیے مشہور ہے۔

اس علاقے میں ایک عمارت کی دیواروں کی لمبائی غیر معمولی حد تک اونچی تھی۔ ایک اہم بات یہ تھی کہ مرکزی عمارت کے دوسرے اور تیسرے فلور پر کھڑکیوں کو سیاہ کر دیا گیا تھا تاکوئی اندر اور باہر سے نہ جھانک سکے۔ کمپاؤنڈ نما اس گھر میں فون یا انٹرنیٹ کنکشن نہیں تھا۔ جو بھی وہاں رہ رہا تھا، اس کے بیرونی تعلقات ختم ہو گئے تھے۔ سی آئی اے کے ایک ماہ کے مشاہدے کے بعد یہ امریکہ کے لیے ایک بہت اچھا موقع تھا کہ وہ اسامہ بن لادن اور اس کے خاندان تک پہنچ سکے۔

دسمبر 2010 میں لیون پنیٹا صدر اوباما سے ملے اور انہیں اسامہ بن لادن کے کمپاؤنڈ میں ہونے کے وسیع امکانات بارے اطلاعات دیں۔ صدر نے انہیں اسامہ بن لادن کو پکڑنے، مارنے کیلئے منصوبے پر کام کرنے کا کہا، جس کے بعد پنیٹا نے ایڈمرل ولیم میکراون کے ساتھ سی آئی اے ہیڈکوارٹرز میں مسلسل ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

فروری 2011 کے آخر میں جب میں لاہور کی لکھپت جیل میں قید تھا، پنیٹا اور میکراون نے کمپاؤنڈ پر حملہ کرنے کے حوالے سے تین ممکنہ بہتر آپشنز کی لسٹ بنائی۔ پہلے آپشن کے مطابق B-2 سٹیلتھ بمبار طیارے کے ذریعے پورے کمپاؤنڈ اور اس کے نیچے ممکنہ سرنگ کو تباہ کرنا تھا۔ دوسرے آپشن کے مطابق ہیلی کاپٹرز کے ذریعے براہ راست

Scanned with CamScanner

سپیشل فورسز کو نیچے اتارنا تھا اور تیسری آپشن کے مطابق پاکستانی حکومت کو اعتماد میں لے کر انہیں آپریشن میں معاونت کا موقع دینا تھا۔ تاہم تیسری آپشن کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا گیا۔

امریکی سیکرٹری دفاع رابرٹ گیٹس نے پہلی تجویز کی حمایت کی۔ ان کے خیال میں امریکی فوج کا دوسرے ملک میں حملے کے لیے اس طرح استعمال اُس ملک کی سلامتی اور اصولوں کے خلاف تھا۔ انہوں نے اوبامہ پر زور دیا جو اسامہ کی موت کا ثبوت دیکھنا چاہتے تھے، یہ تجویز کہ کمپاؤنڈ کو طیارے کے ذریعے بم مار کر تباہ کر دیا جائے، ممکن نہیں تھا، کیونکہ اس سے اسامہ کے DNA کی شناخت نہیں ہونی تھی۔

صدر نے فروری میں دوسری تجویز کی منظوری دی کہ سپیشل فورسز کو پاکستان میں اتارا جائے اور وہ اسامہ کے کمپاؤنڈ پر حملہ کریں۔ مجھے یہ اطلاعات ملیں کہ واشنگٹن میں ایک تشویش یہ تھی کہ اگر میں اس عمارت پر حملہ کرنے سے پہلے آزاد نہیں ہوا تو کوئی بعید نہیں تھی کہ ناراض پاکستانی ہی مجھے مار دیتے۔ میرے ہمدرد لوگ مجھے اس آپریشن سے پہلے چھڑانا چاہتے تھے اور اس کے لیے انہیں اپنی کوششوں کو تیز کرنے کی ضرورت تھی۔

Scanned with CamScanner

24

کوٹ لکھپت جیل، لاہور

(3 مارچ، 36واں دن)

پانچ ہفتے گزرنے کے بعد میں ناامید ہونا شروع ہو گیا۔ ہر دن مایوسی لے کر آتا۔ روز دہی اور چاول کھانے پڑتے۔ کتاب اور امید کے سہارے زندہ رہنا خاصا مشکل کام ہے۔ قونصل خانے کے لوگ جب ملنے آتے تو لگتا زندگی لوٹ آئی ہے۔ ان کے دورے ایک زندگی کی طرح تھے۔ مجھے ان سے بڑی مدد ملی لیکن وہ صرف اتنا ہی کر سکتے تھے۔ ایک دن قونصل خانے کے لوگ مجھ سے ملانے کے لیے حرب کو ساتھ لائے۔ حرب ماہر نفسیات تھا اور انڈیا میں تعینات تھا۔ وہ ستر یا اسی سال کا بوڑھا آدمی تھا لیکن نوجوانوں کی طرح لگتا تھا۔ یعنی مجھے وہ اپنی عمر سے آدھی عمر کا لگا۔

اس نے مجھے ملتے ہی جو پہلی بات کہی وہ یہ تھی کہ "تمھارے ہائی سکول کے دوست جے جے نے مجھ سے کہا ہے کہ تمہارا حال احوال پوچھوں۔ کیا تم جے جے کو جانتے ہو؟"

"میں جانتا ہوں کہ آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

جے جے اور میں نے اکٹھے ہائی سکول سے گریجویشن کیا تھا اور اس کا اور میرا کیریئر بھی ایک ہی طرح کا تھا۔ میں نے آرمی جوائن کر لی اور وہ ایئر فورس کا پائلٹ بن گیا۔ وہ F-16 جٹ طیارہ اڑاتا تھا۔ ہم کئی جگہوں پر ایک دوسرے کے نزدیک رہے۔ وہ اور میں

Scanned with CamScanner

عراق میں ایک ہی وقت میں تعینات تھے۔اس وقت وہ انڈیا میں تعینات تھا اور میں پاکستان میں تھا۔اس کا ایک مطلب یہ تھا کہ ہم دینا گھومتے ہوئے ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے۔حرب میرے پرانے دوست کو جانتا تھا۔مجھے اس کے ذکر اور یاد سے سب کچھ بہت اچھا لگا۔

''تم تو اس وقت ہیڈ لائن میں ہو۔''حرب نے کہا۔

''ہاں!''

''جسمانی طور پر کیسا محسوس کر رہے ہو؟

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔روزانہ میں پش اپ لگاتا ہوں اور جو میں سوچتا ہوں،وہ کرتا ہوں۔''

''کیا کبھی یوگا کیا ہے؟

مجھے ایک جھٹکا لگا۔

''مجھے خوشی ہوگی اگر تم یوگا کرو۔یہ تمہاری حالت کو بہتر کرے گی۔''

''حرب!میں ٹھیک ہوں۔''

''کیا تم نے کسی قسم کی میڈیسن استعمال کی ہیں؟

''ہاں!کبھی کبھار کی ہیں۔لیکن یہ تجویز شدہ تھیں۔یہ مجھے ریلیکس رکھتی ہیں لیکن میں نہیں جانتا کہ میں ان کا عادی ہو چکا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔میں مسئلے میں تمہاری کر سکتا ہوں۔میں تمہیں اس بارے میں گائیڈ کروں گا اور آئندہ تمہیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں رہے گی۔''

''ٹھیک ہے۔''

''جب تم اپنے سیل میں جاؤ تو بیڈ یا کرسی پر ریلیکس پوزیشن میں بیٹھو اور وہ سوچو جو

Scanned with CamScanner

تمہارا ذہن سوچنا چاہتا ہے۔ اپنی آنکھیں بند کر لو اور اپنی تصویر ذہن میں لاؤ۔ سیل کا دروازہ کھولو اور ہال میں آہستہ آہستہ چلنا شروع کر دو۔ یہ مت سوچو کہ تم کہاں جا رہے ہو۔ یہ سوچو کہ تمہارے لیے کیا چیز اہم ہے کہ تم یہ سیل چھوڑ کر جا رہے ہو۔ ہال کے آخر میں ایک دروازہ ہے۔ اسے کھولو۔ آگے سیڑھیاں ہیں۔ ان سیڑھیوں سے نیچے اترنا شروع کرو۔ نیچے اترتے ہوئے وقت لگاؤ۔ سیڑھی کے ہر سٹیپ سے اترتے ہوئے تمہیں ریلیکس ہونا چاہیے۔ اس کے بعد تمہیں لگے گا کہ ایک نئے ماحول میں تم اپنے آپ کو بہتر محسوس کر رہے ہو۔ یہاں پہاڑ ہیں، بیچ ہے اور شہر کے درمیان میں ایک پارک بھی ہے۔ اس نئے ماحول کی آوازیں سنو۔ صاف ہوا میں بچے ہنس رہے ہیں۔ خوبصورت ماحول ہے۔ اس ماحوال میں انجوائے کرو اور جب تک دل چاہتا ہے، اس وقت تک رہو۔"

حرب نے بولنا بند کیا۔ ایک دو منٹ تک وہ ایسے ہی خاموش رہا۔

"اس کے بعد آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے پیچھے کا دروازہ بند کر دو۔ اسی طرح چلتے ہوئے واپس ہال میں آؤ اور دروازہ بند کر کے اپنے سیل میں آ جاؤ۔ اس کے بعد اپنی آنکھیں کھولو۔ تم اپنے سیل میں اسی جگہ پر ہو جہاں پہلے تھے۔ اب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ تم جسے چھوڑنا چاہتے ہو، اسے چھوڑ سکتے ہو۔ تمہارے ذہن کے لیے یہ ایکسرسائز بہت اچھی ہے۔ یہ تمہارے ذہن کو فریش رکھے گی جس کی تمہیں ضرورت ہے۔"

میرے لیے سب کچھ حیران کن تھا۔ حرب واقعی بہت اچھا انسان تھا۔

"میں کوشش کروں گا کہ ایسا ہی کروں۔"

اس کے بعد حرب نے میرے سیل میں آ کر مجھے اس بارے میں مزید گائیڈ کیا۔ اس ایکسرسائز کے نتائج نے مجھے بڑا حیران کیا۔ میں جب چاہتا، جیل سے باہر چلا جاتا اور انجوائے کرتا۔ میں بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ میں اپنے سیل میں ورزش کرتا اور اور ذہنی طور

Scanned with CamScanner

پر اپنے گھر میں ہوتا۔ میں اگرچہ جیل کے سیل میں تھا لیکن کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرا ذہن گھر میں چھٹیاں منا رہا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں ہونے والے اس واقعے کے بعد میں ذہنی طور پر اور مضبوط ہو گیا تھا۔ اس ایکسر سائز نے میرے اندر بہت تبدیلی پیدا کی۔ میں ریلکیس رہتا اور آرام کرتا۔

سٹر یسر اور بخاری میں اس کیس کی بابت بہت اچھی ورکنگ پارٹنر شپ ہو گئی تھی۔ میری قانونی ٹیم نے تمام پوائنٹس سیٹ کر لیے اور اس کے بعد بخاری لکھتا اور سٹر یسر اس کی ایڈیٹنگ کرتا۔ یہ بات سامنے آچکی تھی کہ فیضان حیدر اور محمد فہیم لوگوں سے لوٹ مار کرتے تھے اور وہ اس الزام میں پہلے بھی کئی بار گرفتار ہو چکے تھے۔ ان کی لاشوں سے وہ سامان بھی ملا جو انہوں نے پچھلے چند گھنٹوں میں لوٹا تھا۔ عام حالات میں سادہ سا کیس تھا اور کوئی بھی جج اس پہلو کو ضرور مدنظر رکھتا لیکن میرے چالان میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ پولیس کو کیس کی تفتیش دوبارہ کرنی چاہیے۔

سیشن کورٹ نے جیل کے ندر ہی اس کیس کی سماعت 3 مارچ مقرر کی۔ بخاری میرے وکیل کی حیثیت سے پہلی بار عدالت میں پیش ہوا۔ اس نے دوران سماعت اس نکتے کو اٹھایا کہ میرے سفارتی استثنیٰ کا معاملہ لاہور ہائی کورٹ میں زیر سماعت ہے۔ دونوں طرف کے وکلا کے دلائل کے بعد جج نے میرے استثنیٰ کے معاملے کو مسترد کر دیا۔

میرے لیے اگر کوئی اچھی خبر تھی تو وہ یہ تھی کہ میرے خلاف باضابطہ طور پر فردجرم عائد نہیں ہوئی تھی۔ میں بخاری کا شکر گزار تھا کہ اس کے موقف کہ اسے مقدمے سے متعلقہ تمام دستاویزات ابھی تک موصول نہیں ہوئیں، جج نے منظور کر لی اور جوڈیشل ریمانڈ 15 مارچ تک بڑھاتے ہوئے سماعت 8 مارچ تک ملتوی کر دی، اس دوران میری قانونی ٹیم کو دستاویزات دی جانی تھیں۔ میڈیا میں کئی لوگوں کو یقین تھا کہ اس دن مجھ پر فرد جرم عائد کر

Scanned with CamScanner

دی جائے گی لیکن دوران سماعت بخاری نے ایک بار پھر اپنا جادو چلایا اور اصرار کیا کہ جب تک مجھے مکمل دستاویزات نہیں مل جاتیں، اس وقت تک ملزم پر فرد جرم عائد نہیں ہوسکتی ،اس سے کچھ وقت مل گیا۔میرے پاس اس مشکل سے نکلنے کا صرف ایک حقیقی راستہ بچا تھا کہ حکومت پاکستان میرے استثنٰی کے بارے میں کیا فیصلہ کرتی ہے،اگر وہ مجھے استثنٰی دے دیتی ہے تو مجھے رہا کر دیا جائے گا تاہم میں جانتا تھا کہ اس کے امکانات بہت کم ہیں ،ملک میں کشیدگی ابھی بھی بہت زیادہ تھی ،بڑے شہروں میں مظاہرے ہو رہے تھے اور مذہبی انتہاپسند میرے خلاف خطرناک دھمکیاں جاری کر رہے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ جو بھی جج مجھے استثنٰی دیتے ہوئے واپس جانے کی اجازت دے گا،اسے دن مکمل ہونے سے پہلے قتل کر دیا جائے گا۔

اِدھر میڈیا میں میرے بارے میں جھوٹی خبریں مسلسل چھپ رہی تھیں۔ایک آرٹیکل میں دعویٰ کیا گیا کہ اسسٹنٹ سپرینڈنٹ جیل نے میرے لیے کچھ جاسوس آلات سمگل کئے ہیں۔ان میں فلیش ڈرائیو، ہارڈ ڈرائیو، میموری کارڈ شامل ہیں۔سب جانتے ہیں کہ یہ چیزیں کمپیوٹر میں استعمال ہوتی ہیں۔ایک اور نے دعویٰ کیا کہ میرے چند فیملی ممبران اسلام آباد پہنچ چکے ہیں اور ان کا قیام ایک گیسٹ ہاؤس میں ہے۔حالانکہ ایسا نہیں تھا۔یہ بھی خبر آئی کہ پولیس نے ایسے 45افراد کو گرفتار کیا ہے جن کا مجھ سے تعلق تھا۔مجھے پتہ تھا کہ پولیس نے بے گناہوں کو گرفتار کیا ہے اور ان کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔اس آرٹیکل کے مطابق پولیس کو یہ تمام معلومات میرے سیل فون کے ڈیٹا سے ملیں۔یہ فون میرا نہیں تھا اور یہ پرانے کنٹریکٹر سے لے کر نئے کنٹریکٹر کو دے دیا جاتا ہے۔میڈیا میں میرے خلاف ہونے والی اس لڑائی میں تمام پارٹیاں شامل تھیں۔آئی ایس آئی کے لیے میں ایک مہرہ تھا جسے وہ امریکی حکومت کے ساتھ بات چیت کے لیے استعمال کر رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

25

کوٹ لکھپت جیل، لاہور

(14 مارچ، 47واں دن)

اس وقت کے صدر پاکستان آصف علی زرداری نے کوٹ لکھپت جیل میں قید کے دوران میرے معاملے کو حل کرنے میں مستعد کردار ادا کرنے کی بجائے اپنے کردار کو کم کرتے ہوئے دوسروں پر چھوڑ دیا کہ وہ میری قسمت کا فیصلہ کریں۔ وہ اس معاملے کو طول دینا چاہتے تھے۔

14 مارچ کو حکومت نے میرے سفارتی استثنیٰ پر فیصلہ کرنا تھا، آیا کہ وہ مجھے حاصل ہے یا نہیں۔ اس سے یہ فیصلہ ہونا تھا کہ میں نے زندہ رہنا ہے یا مرنا ہے۔ اس کی ذمہ داری آصف علی زرداری پر تھی تاہم آخری لمحے میں وہ اس پر سٹینڈ لینے سے پیچھے ہٹ گئے اور میرے بوجھ کو آگے لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس اعجاز احمد چوہدری پر ڈال دیا جنہوں نے 6 ہفتے قبل میرا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کرایا تھا۔ دوران سماعت وزارت خارجہ کے وکیل نے تصدیق کر دی کہ میرے پاس سفارتی پاسپورٹ اور ویزا ہے تاہم عدالت نے استثنیٰ دینے سے انکار کر دیا۔

عدالت نے یہ بھی قرار دیا کہ سیشن کورٹ کو اس کیس کا فیصلہ کرنا چاہیے۔ سیشن کورٹ میں پہلے ہی میرا ٹرائل ہو رہا تھا۔ اصل میں کوئی بھی میرے کیس سے جڑے رہنا نہیں چاہتا

Scanned with CamScanner

تھا۔میرے لیے یہ بہت بری خبر تھی۔میری قانونی ٹیم کے لیے آگے چلنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔وہ آہستہ آہستہ کام کر رہی تھی اور پھر اسے تیزی سے کام کرنا تھا لیکن مجھے دو دن میں ''قتل'' کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

26 ابو حذیفہ

کوٹ لکھپت جیل، لاہور

(16 مارچ، 40واں دن)

جس دن میرے کیس کی تاریخ ہوتی تو میں اس رات سو نہیں پاتا تھا۔ جب کہا جاتا کہ سماعت ملتوی ہوگئی ہے یا تاخیر ہوگئی ہے تو بہت عجیب لگتا۔ اس صبح سات بجے ایک گارڈ میرے سیل میں داخل ہوا اور مجھے کہا کہ عدالت جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ وہ میرے لیے گرم پانی اور دو کافی کے پیکٹ لایا تھا۔

میں نے کافی کے گھونٹ لیے اور اپنے وکلا کو دیکھنے لگا لیکن وہاں ابھی تک کوئی نہیں تھا۔ آٹھ بج چکے تھے اور وہ ابھی تک نہیں آئے تھے۔ میں نے کافی کا ایک اور کپ پیا اور دیکھا تو نو بج گئے تھے۔ وکلا ابھی تک نہیں آئے تھے۔

دس بج گئے۔ وکلا نہیں آئے۔

گیارہ بجے تو میرے ذہن میں خیال آیا کہ حالات کس طرف جا رہے ہیں۔ جیل سٹاف واپسی کی تیاری کرنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے پاس آئیں گے اور مجھ سے معذرت کریں گے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا اور میں سیل میں آ گیا۔

تھوڑی دیر بعد مجھے صبح جگانے والا وہی گارڈ آیا اور مجھے کہا کہ آپ لیٹ ہو گئے ہیں۔

Scanned with CamScanner

مجھے ایک جھٹکا لگا۔ کافی کے دو کپ نے مجھے کافی چست کر دیا تھا۔

''میں کیسے لیٹ ہوں۔ میں وہاں صبح سات بجے سے ہوں۔''

گارڈ مجھے دوبارہ صحن میں لے گیا۔ وہاں ایک اور گارڈ موجود تھا جس کے ہاتھ میں ہتھکڑی تھی۔ اس نے مجھے ہتھکڑی پہنائی اور مجھے لے کر ایک طرف کو چل دیا۔ وہ مجھے کورٹ والے راستے کی طرف لے جانے کی بجائے سائیڈ پر بنے ایک کمرے کی طرف لے گیا۔ وہاں میں نے کارمیلا اور اپنے قونصل خانے کی ٹیم کو دیکھا۔ میں کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے گارڈ کی طرف دیکھا جو وہیں موجود تھا۔

''میں اپنے وکلا سے مل رہا ہوں اور اس موقع پر میں کسی گارڈ کی موجودگی نہیں چاہتا۔'' میں نے کہا۔

'' میں معذرت چاہتا ہوں۔ مسٹر ڈیوس ایک خطرناک مجرم ہے اور اسے ہر وقت ہتھکڑی پہنانی ضروری ہے۔'' جیل سپرینڈنٹ نے کہا۔

بخاری نے جیل سپرینڈنٹ سے اردو میں کہا کہ اس کے یہاں سے بھاگنے کا کوئی چانس نہیں ہے۔ اس کمرے میں صرف ایک کھڑکی ہے اور وہ بھی بند ہے۔ گارڈ نے میری ہتھکڑی کھول دی اور دونوں باہر چلے گئے۔

''تو آج کا کیا پلان ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وکلا نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

''وہ منصوبہ بندی اور تاخیری حربوں سے بچنے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں، کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے منتر ہیں، تاخیر، تاخیر، تاخیر......

''تم کیا کہتے ہو؟' پال نے مجھ سے پوچھا۔

''آپ جانتے ہیں۔ آپ سب پروفیشنل ہیں۔ آپ جو سمجھتے ہیں، ٹھیک سمجھتے ہیں اور

Scanned with CamScanner

اس کے مطابق کر رہے ہیں۔ میں خوش ہوں، آپ انہیں شکست دیں گے۔"

....

مجھے ایسا لگتا کہ میں جب عدالت میں پیش ہوتا تھا تو عدالت میں موجود لوگ جج کی یہ بات سننے کے لیے انتظار کر رہے ہوتے کہ میں اس واقعہ کا قصوروار ہوں۔ اس دن عدالت میں پیشی کے دوران مجھے حالات میں کچھ تبدیلی محسوس ہوئی۔ میرے مخالف وکیل اسد منظور بٹ جن کا پہلے دن سے ہی میرے خلاف یہ دعویٰ تھا کہ میں نے فیضان حیدر اور فہیم کو مارا ہے اور اس کے ثبوت موجود ہیں اور جو پہلے مجھے "ڈاگ" کے نام سے بھی مخاطب کر چکا تھا، عدالت میں اس وقت موجود نہیں تھا۔

ان کی جگہ سابق اٹارنی جنرل راجہ ارشاد موجود تھے جو آئی ایس آئی اور ملٹری انٹیلی جنس کے لیے کام کرتے تھے۔ وہ ابراہیم لنکن کی طرح نظر آتے تھے اور اپنی روایتی شلوار قمیض میں ملبوس تھے۔ ان کا بیٹا نائن الیون کے بعد افغانستان میں طالبان کے ساتھ امریکی فورسز سے لڑتے ہوئے ہلاک ہو گیا تھا۔

مین اس وقت چونکا جب جج نے تمام غیر متعلقہ افراد کو عدالت سے چلے جانے کو کہا۔ مجھے اب تک کہانی کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

....

بہت سے لوگوں کو یقین ہے کہ اس سارے کھیل کے پیچھے آئی ایس آئی کے سربراہ جنرل پاشا تھے جو عدالت میں پچھلی قطار پر بیٹھے امریکی سفیر کیمرون منٹر کو موبائل سے اپ ڈیٹ کرتے ہوئے میسج کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ انہوں نے اس شخص کا نام بھی میسج کیا ہوگا جو عدالت میں آیا تو پوری عدالت میں خاموشی چھا گئی۔ کوئی ایک لفظ بھی نہیں بول رہا تھا۔ اگر کوئی سیل فون بجتا تو وہ وہ شخص فوری طور پر باہر چلا جاتا اور وہاں جا کر بات کرتا۔ کمرہ

Scanned with CamScanner

عدالت میں صرف چھت پر لگے پنکھے کے چلنے کی آواز آرہی تھی۔

کارمیلا اوران کی ٹیم عدالت میں پہلی رو میں بیٹھی تھی۔ میں نے پال کی توجہ ایک شخص کی طرف مبذول کراتے ہوئے پوچھا کہ ''وہ شخص کون ہے؟''

''وہ ......وہ آئی ایس آئی کا کرنل ہے۔ کیوں......''

''اوہ! اس شخص نے واقعے کے پہلے روز فوجی علاقے کے پولیس اسٹیشن میں مجھ سے انٹروگیشن کی تھی۔ میں نے اس وقت یہ محسوس کیا تھا کہ اس کا تعلق آئی ایس آئی سے ہے۔ لیکن یہ یہاں کیوں ہے؟''

''یہ ''فکسر'' ہے۔''

''اس کا کیا مطلب ہے؟''

''یہ تمہارے لیے اچھا ہے کہ یہ یہاں موجود ہے۔'' پال نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

شائد میرا تجربہ میری مثبت سوچ کی طاقت کو پیچھے دھکیل رہا تھا یا یہ اس ڈبل کافی کا اثر تھا جو میں پی چکا تھا۔ وجہ کچھ بھی تھی، میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

تھوڑی دیر بعد پال نے مجھے کیس کی بابت اپ ڈیٹ کرتے ہوئے بتایا کہ پلان تبدیل ہوگیا ہے۔

''عدالت نے کیس کو شریعت کورٹ منتقل کردیا ہے، جس پر مجھے جھٹکا لگا۔ میں نے کہا:

''یہ کیسے ہوسکتا ہے، اب مجھے پتھروں سے سنگسار کیا جائے گا؟ آنکھ کے بدلے آنکھ......''

مجھے غصہ آنے لگا۔

''کیا تم سیریس ہو؟ وہ کیسے کرسکتے ہیں؟ میں اسے نہیں مانتا۔''

لیکن یہ چند آخری الفاظ میرے منہ میں ہی رہ گئے۔ پال دوڑتا ہوا باہر چلا گیا۔

Scanned with CamScanner

ابو حذیفہ

27

کوٹ لکھپت جیل، لاہور

(16 مارچ، 49واں دن)

اس پورے کیس کے دوران کارمیلا وہ شخصیت تھی جس پر میں اعتماد کرسکتا تھا۔وہ اس پورے کیس کے دوران میرے ساتھ رہی تھی ۔وہ اصل میں میرے کیس کی نگران بھی تھی اور میں سمجھتا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہی ہے، بہتر کر رہی ہے۔وہ عدالت میں پہلی نشستوں پر موجود تھی۔

میں نے اس کی طرف توجہ کی اور پوچھا۔

”کارمیلا! کیا ہو رہا ہے؟“

”تمہارا کیس شریعہ کورٹ میں بھیج دیا گیا ہے۔۔رے!“

”کیا مجھے پتھروں سے مارا جائے گا؟“

”شریعت کورٹ میں کیس جانے کا مطلب یہ نہیں جو تم سوچ رہے ہو بلکہ قصاص کے علاوہ دیت کی بھی اجازت ہے جو متاثرہ خاندان کو راضی ہونے پر دی جاتی ہے۔“

کارمیلا نے مجھے کہا۔

لیکن مجھے اس وقت دیت اور قصاص کی سمجھ نہیں آئی اور میں نے آنکھ کے بدلے آنکھ کے اصول کو سامنے رکھتا، یعنی جس پر قتل کا جرم ثابت ہوتا ہے اسے مار دیا جاتا ہے اور یہی

Scanned with CamScanner

میرا مقدر ہے، ہر طرف سے اشارے بھی اسی قسم کے مل رہے تھے، مذہبی انتہا پسند بھی مجھے مرتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔

کارمیلا میرے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ رہی تھی۔

کارمیلا نے جلدی سے پھر دوہرایا:

"دیت کی آپشن بھی ہے جس میں متاثرہ خاندان کو خون بہا دیا جاتا ہے اور اس مقدمے میں بھی ان کے لواحقین کو معاوضہ دیا جائے گا اور تم رہا ہو جاؤ گے۔"

مجھے یہاں سے باہر جانے کے لیے کسی کو بھی پیسہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔"

"نہیں رے! تم غلط سمجھ رہے ہو۔ تمہیں باہر نکالنے کا یہی بہترین حربہ ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی آپشن نہیں۔ ہم تمام حربے آزما چکے ہیں۔ تمہیں رہا کروانے کے لیے یہ بہترین ڈیل ہے۔" کارمیلا نے کہا۔

مجھے ایسا سننے کی امید نہیں تھی، کیونکہ مجھے ایسا ہوتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا۔ تاہم مجھے کارمیلا پر اعتماد تھا اور میں نے اسے کہا کہ تم جو کرنا چاہتی ہو، کرسکتی ہو۔

ایک دن جب میں نے کارمیلا سے پوچھا:

"کیا ہو رہا ہے؟"

کارمیلا نے بتایا: "اس ڈیل کیلئے لواحقین کے ہر فرد کا راضی ہونا ضروری ہے اور اگر ایک بھی انکار کردے تو ڈیل نہیں ہوسکتی اور میں نے خاندان کے لوگوں کو دیکھا ہے۔ خواتین خوش دکھائی نہیں دے رہیں۔"

میں اس معاملے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

تاہم مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ منصوبہ کئی ہفتے پہلے بنالیا گیا تھا۔ کچھ رپورٹوں کے

Scanned with CamScanner

مطابق امریکہ میں پاکستان کے سفیر حسین حقانی کے امریکی وزیر خارجہ جان کیری کے ساتھ دورہ پاکستان کے دوران یہ معاملہ طے ہوا۔ جبکہ کچھ نے بتایا کہ امریکی سفیر کیمرون منٹر اور آئی ایس آئی چیف جنرل پاشا کے درمیان ہونیوالی ملاقات میں یہ منصوبہ تشکیل دیا گیا۔ یہ افواہ بھی تھی کہ اس میں فوج، صدر آصف علی زرداری اور نواز شریف بھی شامل ہیں۔ اس کا کریڈٹ کسی ایک فرد کو نہیں جاتا تھا۔ بلکہ سب اس میں ایک گروپ کی طرح کام کر رہے تھے۔ امریکہ اور پاکستان میں جاری اس سفارتی کشیدگی کو ختم کرنے کے لیے سب اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے تھے تاکہ کچھ ضائع کئے بغیر نتائج حاصل کئے جا سکیں۔ میں واحد شخص تھا جسے آخری لمحات تک کچھ پتہ نہیں تھا۔

جب اس منصوبے پر اتفاق ہو گیا تو اس کے بعد یہ آئی ایس آئی پر تھا۔ جنرل پاشا ڈیل کو کامیاب کرانے میں پوری طرح سنجیدہ تھے، انہوں نے 18 مارچ کو ریٹائر ہو جانا تھا، تاہم وہ مزید ایک سال کیلئے عہدے پر رہنے کیلئے تیار ہو گئے۔ وہ اس بات کے لیے بھی ذمہ دار تھے کہ کیس کے پہلے پراسیکیوٹر اسد منظور بٹ کو تبدیل کر دیا جائے۔

یہ منصوبہ اسی صورت کامیاب ہو سکتا تھا جب خاندان کے 18 افراد دیت پر راضی ہوتے۔ اسی لئے آئی ایس آئی کے لوگوں نے وکیل کی مدد سے انہیں دیت پر راضی کرنے کیلئے خاندان کے ہر ایک فرد پر حسب ضرورت دباؤ ڈالا، تاہم ان میں سے کئی لوگوں نے اپنے وکیل بٹ کی وجہ سے مزاحمت کی۔ ان میں سے ایک محمد فہیم کا بھائی وسیم شہزاد بھی تھا جس پر مذہبی سیاستدانوں نے انصاف حاصل کرنے کیلئے زور دیا تھا۔ وسیم اپنے بھائی کے خوان کا حساب چاہتا تھا، اس لیے وہ کئی ہفتوں تک راضی نہیں ہوا۔

راضی نہ ہونے والوں میں ایک اور مشہود الرحمان بھی تھا جس کے بھائی کو مجھے بچانے کے لیے آنے والی SUV نے کچل دیا تھا۔ مشہود نے حال ہی میں برطانیہ سے اپنی قانون

Scanned with CamScanner

کی ڈگری حاصل کی تھی۔اس نے میری پیشی کے موقع پر کہا تھا کہ ”میں براہ راست رقم نہیں مان سکتا۔ یہ خاندان کے اعزاز کا ایک سوال ہے۔سب سے پہلے انصاف ہونا چاہیے۔

تمام اسلامی جماعتیں اپنے ایجنڈے کو آگے بڑھاتے ہوئے وکلا کے ذریعے لواحقین پر دباؤ ڈال رہی تھیں۔

....

آئی ایس آئی کے لوگوں نے 14 مارچ کو اس معاملے میں مداخلت کی اور لواحقین کے اُن 18 لوگوں کو جیل میں بند کر دیا جب دو دن بعد 16 مارچ کو میری قسمت کا فیصلہ ہونا تھا۔ ان سب کو 16 مارچ تک قید میں رکھا گیا۔وکیل بٹ فون کے ذریعے بھی ان میں کسی تک پہنچنے سے قاصر تھا۔ پڑوسیوں نے اسے یہی بتایا کہ وہ لوگ اچانک غائب ہو گئے ہیں۔

16 مارچ کو میری قسمت کا فیصلہ تھا۔ 16 مارچ سے ایک رات قبل آئی ایس آئی نے خاندان کے تمام افراد کو کوٹ لکھپت جیل میں منتقل کر دیا اور ان کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ دیت قبول کر لیں اور اگر وہ قبول کر لیں گے تو انہیں ایک بڑی رقم بدلے میں دی جائے گی۔

انہیں دھمکی دی گئی کہ اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو دوسری صورت میں نتائج ان پر اگلی صبح واضح کر دیئے گئے جب انہیں عدالت کے باہر گن پوائنٹ پر کئی گھنٹے قید رکھا گیا اور انہیں سختی سے میڈیا کے سامنے ایک لفظ بھی بولنے سے روکا گیا۔

جب بٹ اس صبح عدالت کے باہر پہنچا تو اس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا گیا۔

بٹ نے بی بی سی سے گفتگو کرتے ہوئے بتایا:

”مجھے اس بات کی اجازت نہیں دی گئی کہ کیس لڑ سکوں۔ مجھے میرے کلائنٹس کو دیکھنے اور پہنچنے نہیں دیا گیا۔ مجھے اور میرے ساتھیوں کو چار گھنٹے تک حراست میں رکھا گیا۔“

بٹ اس قابل نہیں تھا کہ اپنے کلائنٹس سے بات کر سکتا۔ 16 مارچ کو عدالت کے

Scanned with CamScanner

سامنے یہ دیکھا گیا کہ خواتین کیلئے یہ بہت مشکل بات تھی، وہ رو رہی تھیں۔ کارمیلا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

ان لواحقین کے نئے وکیل ارشاد نے محمد فہیم اور فیضان حیدر کے خاندان کے 18 افراد کی دستخط شدہ ایک دستاویز عدالت کو پیش کی جس میں ملزم کو معاف کرنے اور دیت لینے پر رضامندی ظاہر کی گئی تھی۔ تمام عورتیں اس موقع پر رو رہی تھیں۔ جج نے تمام رشتہ داروں کو اپنی شناخت ثابت کرنے کیلئے دستاویزات دکھانے کو کہا۔ پھر ان کو رسید دی گئی جس میں 18 افراد کو دی جانیوالی رقم لکھی تھی۔ فی کس ایک لاکھ تیس ہزار ڈالر اور کل 23 لاکھ 40 ہزار ڈالر۔

پاکستان کی تاریخ میں خون بہا کے طور پر دی جانے والی یہ سب سے زیادہ رقم تھی۔

ہر رشتہ دار کی جانب سے ضروری دستاویزات پر دستخط کرنے کے بعد جج نے کہا کہ آپ میں سے کسی کو بھی یہ کرنے پر مجبور تو نہیں کیا گیا؟

تمام 18 افراد نے جواب دیا کہ نہیں۔

اس کے بعد جج نے ڈیفنس اور پراسیکیوشن کو یاد دلایا کہ وہ اس پر اعتراض کر سکتے ہیں، لیکن کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ اس دن خاندان کے تمام افراد کے سمجھنے کیلئے کارروائی چونکہ اردو میں ہو رہی تھی اس لئے مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا، تاہم مجھے کارمیلا نے بتایا:

''تمام افراد نے دیت قبول کر لی ہے اور تم رہا ہونے جا رہے ہو۔''

میں نے پوچھا کب.....

''جتنی جلدی یہ کام مکمل ہو جاتا ہے۔ باہر گاڑی کھڑی ہے اور ڈیل نامی شخص تمہارے ساتھ ائیر پورٹ جا رہا ہے جہاں تمہیں میڈیکل ٹیسٹ کی ضرورت ہوگی اور اس کے بعد تم

Scanned with CamScanner

جہاز میں لے جائے جاؤ گے اور پھر تمہیں گھر واپس بھیج دیا جائے گا۔"

کارمیلا نے کہا۔

میں یہ سب سن کر ششدر رہ گیا۔ میں اتنی جلدی کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ سب کچھ آہستہ آہستہ ہوگا لیکن سب کچھ میرے لیے حیران کن تھا۔

"میں آج یہاں سے جا رہا ہوں؟"

"ہاں رے! تم گھر جا رہے ہو۔"

میں خوشی سے نہال ہو گیا۔ میرا دل چاہا کہ میں اس خوشی کا اظہار اس طرح کروں جس طرح سونامی کرتا ہے۔ 49 دن کا لحہ لحہ میں نے کس طرح گزارا۔ اس موقعہ پر میں نے محسوس کیا کہ میں واقعی رہا ہو گیا ہوں اور یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ اچانک مجھ پر واپس جانے کی خوشی اور اداسی طاری ہو گئی۔

لیکن میں ایک خاوند اور باپ تھا جسے واپس گھر جانے میں دیر نہیں کرنی چاہیے تھا۔ یہ سوچ کر میں ایک بچے کی طرح رونے لگا۔

Scanned with CamScanner

28 ابو حذیفہ

کوٹ لکھپت جیل، لاہور

(16 مارچ، 49 واں دن)

اسی دن امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن سے قاہرہ کے دورے کے دوران نیشنل پبلک ریڈیو کی سٹیو لینسکیپ نے سوال کیا کہ ریمینڈ کو رہا کروانے کے لیے خون بہا کے لیے دی جانے والی رقم نے کتنا کردار ادا کیا تو ہلیری کلنٹن نے جواب دیا۔

''ہم نے ریمنڈ ڈیوس کو رہا کرانے کیلئے کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا۔لواحقین کی فیملیز نے ریمنڈ کو معاف کیا جس پر ہم ان کے شکر گزار ہیں۔اس کے علاوہ ہم پاکستان کے لوگوں اور حکومت کے شکر گزار ہیں۔ ہمارے پاکستان کے ساتھ بڑے مضبوط تعلقات ہیں اور ہم انہیں اور مضبوط بنانا چاہتے ہیں۔''

ہیلری کلنٹن نے مزید کہا:

''امریکہ نے کسی قسم کا معاوضہ ادا نہیں کیا۔''

تکنیکی لحاظ سے وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ نیو یارک ٹائمز کے مطابق:

''پیسے آئی ایس آئی نے دیئے تھے اور بعد میں امریکہ نے یہ رقم پاکستانی حکومت کو ادا کر دی تھی۔''

آئی ایس آئی میرے باہر آنے کی تخلیق کار تھی۔اس کے بہت سے ایجنٹ عدالت

Scanned with CamScanner

کے باہر موجود تھے۔ میں اپنے سیل کے باہر واک کر رہا تھا کہ انہوں نے مجھے انتہائی برے طریقے سے اٹھایا اور پانچ گھنٹوں تک عدالت میں بٹھائے رکھا۔

''کیا میں اگلی میٹنگ میں جانے سے پہلے اپنے سیل کا واش روم استعمال کر سکتا ہوں؟''

''آئی ایم سوری! ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔''

''آپ کیوں نہیں سمجھ رہے۔ میں کورٹ روم کے اندر تمام دن بیٹھا رہا ہوں۔ مجھے وہاں جانے کی ضرورت ہے۔''

اس نے اپنے ایک ساتھی سے مشورہ کیا اور مجھے کہا:

''او کے۔ لیکن ذرا جلدی کرنا۔''

انہوں نے مجھ سے میرا اسیل فون لے لیا لیکن مجھے بہت وقت نہیں دیا۔ ''چلو، جلدی کرو۔''

جب تک میں واپس نہیں آ گیا۔ وہ بار بار بولتا رہا۔

مجھے پتہ نہیں تھا کہ آخر اتنی جلدی کیا ہے؟ میرا خیال تھا کہ میری قونصلیٹ کے سٹاف کے ساتھ ایک میٹنگ ہو گی لیکن آئی ایس آئی کے لوگ اپنے سینئرز کے حکم کے پابند تھے۔ جب تک میں واش روم میں رہا، وہ باہر رہے اور مجھے نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ مجھے اتنا بھی وقت نہیں ملا کہ میں اپنے سیل سے کچھ چیزیں اٹھا سکوں۔

مجھے بند دروازے کے پیچھے سے SUV گاڑی کے ڈیزل انجن کی آواز آئی۔ میں کسی کے کہے بغیر یہ جان گیا تھا کہ باہر کوئی میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ میں آج نہیں جا رہا لیکن نہیں جانتا تھا کہ میں ابھی جا رہا ہوں۔

اچانک وہ آدمی جو باہر تھا، جلدی کرو، جلدی کرو کی آواز لگانے لگا۔ میں نے راہنمائی

Scanned with CamScanner

کرنے والے اس آدمی سے کہا۔

''پلیز، انتظار کریں سر!''

ایک آدمی نے دروازہ کھولا اور صحن میں نکل آیا۔ اس نے صحن کو کلیئر کیا اور SUV کو صحن میں آنے کی ہدایت کی۔ میں نے تیزی سے صحن کراس کیا اور دو اور ایک آدمی نے مجھے SUV تک پہنچایا۔ گاڑی کے قریب جاتے ہی مجھے ایک جھٹکا لگا۔ میں نے ڈیل رش کو نہیں دیکھا تھا جو سفارت خانے کا ڈاکٹر تھا اور مجھے جیل میں ملنے آیا تھا۔ میں نے دو اور آدمیوں کو دیکھا جو پاکستانی لگ رہے تھے۔ میری دائیں طرف کھڑے آدمی نے SUV کا پچھلا دروازہ کھولا اور مجھے گاڑی کے اندر دھکیلنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے انتظار کرنے کی ہدایت کی اور کھڑا رہا جب تک کہ ڈرائیور میرے قریب آیا اور کہنے لگا:

''میں امریکی سفارت خانے سے ہوں۔ میرا اعزاز ہے کہ اسے ڈرائیو کر رہا ہوں۔''

گاڑی کی مسافر سیٹ پر بیٹھا آدمی مسلسل فون کر رہا تھا۔ آخر اس نے فون بند کیا۔ میں نے پوچھا کہ ''وہ کون ہے؟''

''وہ میری طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا: ''میں کرنل ہوں۔''

''میں کرنل ہوں۔''

آئی ایس آئی کے آفیسرز ایسے سادہ اور معصوم لگ رہے تھے جیسے انہوں نے میرے لیے کچھ نہیں کیا۔ یہ سوچ کر مجھے ہنسی آ گئی۔

....

جیسے ہی گاڑی نے چلنا شروع کیا تو جیل کی دیواروں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم کوئی راستہ تلاش کرنے کا سفر کر رہے ہیں۔ جب تک جیل کا بڑا گیٹ نہیں آ گیا اور وہ ہمارے لیے کھولا نہیں گیا تو مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ ہم یہاں سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔ میں

Scanned with CamScanner

نے ڈیل کو دیکھا جو ایک طرف بیٹھا تھا۔

”کیا ہو رہا ہے، ڈیل.....؟“

ڈیل نے مجھے کہا۔”نیچے بیٹھ جاؤ۔“

”ڈیل! کیا چیک کرنا چاہتے ہو؟“

”تمہیں آرام سے نیچے بیٹھے کی ضرورت ہے۔ہم نہیں چاہتے کہ میڈیا کی نظر تم پڑے اور وہ یہ جان لے تم یہاں سے جا رہے ہو۔“

وہ ان چیزوں کو بہتر سمجھتے تھے۔ میں ان لوگوں کے درمیان پھنستے ہوئے نیچے بیٹھا لیکن اس طرح پھنس کر بیٹھا آسان نہیں تھا۔

ہم گیٹ کی طرف جانے لگے۔ کئی دوسری گاڑیاں ہمارے قافلے میں شامل ہو گئیں۔ کچھ گاڑیاں ہمارے آگے اور کچھ پیچھے تھیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ڈیل کچھ پریشان لگ رہا تھا۔ میں اس کی آواز سن رہا تھا۔

”سب ٹھیک ہے۔ اسی طرح بیٹھے رہو۔ ہم ٹھیک جا رہے ہیں۔“ ڈیل نے مجھے کہا۔

”ڈیل! دھیمے رہو۔ تم پریشان کیوں ہو؟“

”سوری۔ میں نے یہ سب کچھ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

ڈیل کے اعصاب اور مجھ میں ایک واضح فرق تھا، لیکن جس طرح سے آپ سوچ سکتے ہیں اس طرح میں نہیں سوچ سکتا۔ مجھے پتہ چلا کہ ہم میں سے ہر ایک کے سوچنے کی سطح مختلف ہے۔ اس بات نے مجھے واقعی پرسکون کیا۔ جب تک میں پاکستان سے نکل نہیں سکا، میں بھی بہت پریشان تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے ملک سے باہر سمگل کرنے کے لئے جو بھی منصوبہ بنایا گیا تھا، وہ تمام بحران سے نکلنے کا بڑا آسان حربہ تھا۔

”دیکھو، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں، تمہیں کسی چیز کے

Scanned with CamScanner

بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اوکے۔''

میں کھڑکی سے باہر جھانک کر یہ دیکھ رہا تھا کہ ہم کہاں ہیں؟

ڈیل نے اپنا فون نکالا اور اور کہا: ''مجھے باس سے بات کرنی چاہیے۔''

میں باہر کا نظارہ کرتے ہوئے روڈز کو جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ہم جیل سے باہر آ گئے ہیں۔ ہم ایئرپورٹ کے راستے پر ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد سر جھٹکتے ہوئے ڈیل نے فون اپنی جیب میں رکھا اور پوچھا۔

''ہم ایئرپورٹ سے کتنے فاصلے پر ہیں؟''

گاڑی کے آگے بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

میں کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔''ہم پندرہ منٹ کی دوری پر ہیں ڈیل!''

ڈیل نے مجھے غور سے دیکھا اور یہ معلومات آگے باس کو فون پر بھجوا دیں۔

دس منٹ..... ڈیل مجھے دوبارہ پریشان نظر آ رہا تھا۔

''اب ہم کتنی دوری پر ہیں؟''

پانچ منٹ.... میں نے جواب دیا۔

پانچ منٹ بعد ہم ایئرپورٹ پہنچ گئے۔

ڈیل نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہا ہو۔''تم واقعی ارد گرد کا راستہ جانتے ہو۔''

''یہ نوکری کے معمول کا حصہ ہے۔''میں نے کہا۔

....

تھوڑی دیر میں ہم اپنے سٹاپ پر پہنچ گئے۔ڈیل نے مجھے پکڑا اور کہا ہمیں اندر جانا

Scanned with CamScanner

ہے جہاں تمہارا ایک پاکستانی ڈاکٹر چیک اپ کرے گا۔

مجھے کپڑے بدلنے کی ضرورت تھی لیکن بدلنے نہیں دیئے گئے۔ سب مجھے جلد سے جلد جہاز پر بٹھا دینے کی جلدی میں تھے اوہ وہ چاہتے تھے کہ یہ جلد سے جلد ہو۔ ڈیل مجھے لے کر ایک عمارت میں داخل ہوا جہاں ایک ڈاکٹر میرا انتظار کر رہا تھا۔ ہمارے ساتھ گاڑیوں میں آنے والا ایک آدمی وہاں آیا اور میں جو کچھ کر رہا تھا، اس کی ویڈیو بنانے لگا۔ شائد وہ شواہد کے لیے ایسا کر رہا تھا۔ حتیٰ کہ جب ڈاکٹر نے مجھے کپڑے اتارنے کو کہا تو اس وقت بھی وہ آدمی میری فلم بناتا رہا۔

''واہ، کیا بات ہے۔'' میں نے سوچا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر نے مجھے کلیئر قرار دے دیا اور کہا کہ کوئی انجری نہیں ہے۔

اس مرحلے میں کچھ دیر ہوگئی۔ جس کے بعد ڈیل نے مجھے کپڑے بدلنے نہیں دیئے اور کہا:

''ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ تم کپڑے جہاز میں بدل لینا۔ ہمیں فوری جانا ہے۔''

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

29

ابو حذیفہ

کابل ایئر سپیس

(16 مارچ، 49واں دن)

ائیر پورٹ کے رن وے پر دو انجنوں والا سیسنا جہاز تیار کھڑا تھا۔ جہاز کے انجن چل رہے تھے اور وہ چلنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ اسے روانگی کے لیے صرف دو مسافروں کا انتظار تھا، میں اور ڈیل ..... میں بھاگتا ہوا جہاز کے قریب پہنچا۔ میں اس وقت بھی اپنی شرٹ کے بٹن بند کر رہا تھا۔ میرے شوز کے تسمے بھی بند نہیں ہوئے تھے۔

سوٹ میں ملبوس ایک بوڑھا آدمی سیڑھیوں کے نیچے کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس آدمی نے ہاتھ نیچے کیے اور بغیر کچھ سوچے سمجھے گلے ملا، اسی وقت پیچھے سے ایک خاتون سامنے آئی۔ وہ میری بہترین دوست تھی اور اس نے سامنے آکر بوڑھے آدمی کا مجھ سے باضابطہ تعارف کرایا۔

"رے! یہ کیمرون منٹر ہیں۔ پاکستان میں امریکی سفیر"

میں نے انہیں برادرانہ طور پر گلے لگایا۔ کیمرون منٹر نے کہا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ وہ میرا بھاری بیگ خود جہاز میں لے کر جائیں گے۔ وہ بھی میری سکیورٹی کیلئے جہاز میں میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ "تم سوچ نہیں سکتے کہ تم کس طرح اس ملک سے جا رہے ہو۔ یہاں سے ٹیک آف کرنے میں

Scanned with CamScanner

بھی کچھ بیورو کریٹک مسائل ہیں۔ اس لیے میں یہاں خود موجود ہوں۔ تم بہتر جانتے ہو۔ تمہیں مارنے کے لیے کچھ دہشت گرد گروپوں کی بھی کوشش ہے۔''

امریکی سفیر کی وہاں موجودگی یہ ثابت کرتی تھی کہ وہ مجھے خاموشی سے نکالنا چاہتے تھے۔

ڈیل کا رول میرے لیے ہر ممکن حد تک ضروری تھا۔ DOD جوائنٹ پرسنل ریکوری ایجنسی کا کام مجھے طویل عرصے تک قیدی ہونے کے بعد دوبارہ معمول کی زندگی میں مدد کرنا تھا۔ ڈیل نے تجویز کیا تھا کہ وہ لاہور سے طیارے میں میرے ساتھ ہی سفر کرے گا۔ چونکہ وہ روز اول سے ہی میرے ساتھ تھا، اس لیے میں اس پر اعتماد کرتا ہوں اور اس کی حالت کو بہتر بنانے میں معاونت کروں گا۔

تھوڑی دیر میں ہم اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ جہاز کے تین رکنی سٹاف نے دروازے بند کئے اور جہاز نے رن وے پر دوڑنا شروع کیا۔ جب ہمارے جہاز نے مجھے ایئر پورٹ پر ڈراپ کرنے والی SUV گاڑی کو کراس کیا جو نزدیک ہی پارک تھی تو اس کے پاس کھڑے آئی ایس آئی کے کرنل نے مجھے ''گڈ بائی'' کا اشارہ کیا۔

....

جب ہم لاہور میں ہوائی اڈے سے نکل رہے تھے تو یہ دوپہر کا آغاز تھا۔ واشنگٹن ڈی سی میں نو گھنٹے بعد ہی لوگوں کو اٹھنا تھا۔ امریکی سفیر چاہتا تھا کہ جب وہ اپنے دفتر میں اور میں اپنے گھر کے راستے میں ہوں تو امریکی پریس کو اس سٹوری کا پتہ چلے کہ میں آزاد اور محفوظ ہوں۔ امریکی سفیر نہیں چاہتے تھے کہ ہمارے ایئر پورٹ سے نکلنے کا بھی کسی کو پتہ چلے، یہ بہت برا ہوتا اگر میڈیا کو پتہ چل جاتا اور ہمارے جہاز کو کچھ وجوہات کی بنا پر دوبارہ لاہور ایئر پورٹ پر اتار لیا جاتا۔

Scanned with CamScanner

''ہم کتنی دیر میں کابل ایئر بیس پر پہنچیں گئے؟ امریکی سفیر نے فلائٹ کریو کے عملے سے پوچھا۔

''ایک گھنٹہ چالیس منٹ سر!''

ایک گھنٹے بعد انہوں نے پھر پوچھا۔

''ایک گھنٹہ دس منٹ سر''

''کیا.... یہ کیسے ممکن ہے؟''

''ہماری سپیڈ کافی سست ہے۔ ہم ہواؤں کے جھکڑ میں ہیں۔''

''اوہ! گریٹ۔

''میں نے کہا: ''پاکستان میں کچھ ہے جو مجھے چھوڑ نہیں رہا۔ مجھے دوبارلانے کی کوشش کررہا ہے۔''

میں تھوڑا مذاق کے موڈ میں تھا۔ مجھے فلائٹ کریو نے ایک کاغذ لاکر دیا۔

''رے، ہم تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتے ہیں۔

میں نے کاغذ کا ٹکڑا کھولا۔ اندر ایک سکہ تھا جس پر لکھے گئے الفاظ تھے:

کابل کے ہوائی اڈے پر خوش آمدید

اب میں جشن منا سکتا تھا۔ میں اب آزاد تھا۔

امریکی سفیر نے دوران پرواز سٹیلائٹ فون سے کئی کالز کیں جس میں انہوں نے چند خاص خاص لوگوں کو میری رہائی کی خبر سنائی۔ ان میں سنیٹر جان کیری، کانگریس مین فرینک وولف، پاکستان اور افغانستان کے لیے امریکی نمائندہ خصوصی مارک گراسمین اور رچرڈ ہالبروک شامل تھے۔ ایک فون کال کے بعد امریکی سفیر نے فون میرے ہاتھ میں دے دیا اور کہا کہ وزیر خارجہ ہلیری کلنٹن لائن پر ہیں۔ ان سے بات کریں اور اگر آپ مائنڈ نہ کریں

Scanned with CamScanner

تو میرے اور میرے لوگوں کی کوششوں کے بارے میں بھی چند لفظ بول دیں۔

میں نے گلہ صاف کیا اور بولا: ہیلو میڈم سیکرٹری......

ہلیری کلنٹن نے یہ سن کر کہا:

''مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ آپ محفوظ ہیں اور ہمیں آپ پر فخر ہے۔''

''مجھے خوشی ہے اور میں آپ کے لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میرے لیے اتنا کچھ کیا۔ آپ نے بہت اچھی ٹیم دی جس نے اس صورتحال میں میری اس طرح مدد کی۔''

میں نے ہیلری کلنٹن کا بہتر ٹیم فراہم کرنے اور مجھے رہا کرانے پر شکریہ ادا کیا۔

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

30 ابو حذیفہ

اختتامیہ

پاکستان میں میری رہائی سے کوئی بھی خوش نہیں تھا۔ 11 اپریل کو جنرل پاشا واشنگٹن آئے اور پاکستان کے تحفظات بارے لیون پنیٹا اور ایڈمرل مائیک مولن کو آگاہ کیا، لیکن اس ملاقات میں جو پیش رفت ہوئی وہ تین ہفتوں بعد اس وقت غائب ہو گئی، جب امریکی فورسز نے ایبٹ آباد میں واقع کمپاؤنڈ پر حملہ کر کے اسامہ بن لادن کو ہلاک کر دیا۔

پاکستانی حکام نے توقع سے سخت ردعمل دیا اور اسے پاکستان کی قومی سلامتی کی خلاف ورزی قرار دیا تاہم جب دھواں ختم ہوا تو پھر اس کی ذمہ داری ان پر تھی کہ بتائیں کہ کیسے دنیا کا خطرناک ترین دہشت گرد 6 سال سے ان کے ملک کی ممتاز ملٹری اکیڈمی سے ایک میل کے فاصلے پر رہ رہا تھا۔ تاہم انہوں نے ذمہ داری کا احساس کرنے کی بجائے جارحانہ رویہ اختیار کیا اور سیکرٹری خارجہ سلمان بشیر نے کہا کہ مستقبل میں ایسا واقعہ ہوا تو اس کے خوفناک نتائج ہوں گے۔ اس واقعہ کے بعد پاکستان اور امریکہ کے تعلقات تاریخ کی نچلی ترین سطح پر آ گئے۔ یہ تعلقات 1979 میں اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے پر حملے کے بعد بھی کشیدہ ہوئے تھے۔

میں ابھی تک یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ میں نے دونوں ممالک کے درمیان کشیدگی بڑھانے میں حصہ لیا تھا۔ مجھے لاہور میں دو افراد کو گولی مارنے کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ زندگی کے لیے خطرے کی صورت حال کا مناسب جواب تھا۔

اگر پاکستان ایک ایسے امریکی کو سزا دیتا جو سفارتی پاسپورٹ اور استثنیٰ کا حامل تھا تو

Scanned with CamScanner

پاکستان سفارتی قوانین کی خلاف ورزی کرتا۔ امریکی سفیر کیمرون منٹر نے بعد میں ایران میں امریکی سفارت کاروں کو یرغمال بنائے جانے کے بحران کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ”ایرانی طلبا کے گروپ نے امریکی سفارت خانے پر حملہ کر کے 60 امریکی سفارتی اہلکاروں کو یرغمال بنا لیا اور انہیں 444 دنوں تک یرغمال بنائے رکھا۔ کیا ہم اس قابل نہیں تھے کہ ہم ریمنڈ ڈیوس کو باہر نکال سکتے۔ اگر وہ ریمنڈ ڈیوس کو سزا سنا دیتے تو اس سے تعلقات میں خرابی تو آنی تھی۔ لیکن پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں کشیدگی اس نہج تک نہیں پہنچی۔ اس صورتحال کو کنٹرول کرنے کے لیے دونوں ملکوں میں اعلیٰ سطح پر میٹنگز ہو رہی تھیں۔ آصف علی زرداری اپنی پانچ سال کی صدارت کی مدت پوری کرنا چاہتے تھے، جبکہ امریکی صدر اوباما 2012 کے لیے دوبارہ صدر منتخب ہونا چاہتے تھے، جنرل کیانی اور اور لیون پینٹا کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ تھا۔ جبکہ واقعے سے ناواقف سیاست دان اور فوجی راہنما پانی میں بطخ کی طرح تھے۔

میری رہائی کے عوض متاثرہ خاندان کو خون بہا کی جو رقم ادا کی گئی تھی، وہ رہائی کے تقریباً ایک سال بعد کہیں زیادہ خونی ثابت ہوئی۔ فیضان حیدر کی اہلیہ زہرا کا انتہائی غریب خاندان اس حد تک متمول ہو گیا تھا کہ وہ فیروز والہ کی کچی بستی سے جوہر ٹاؤن کی خوشحال آبادی میں منتقل ہو گیا۔ دولت کی ریل پیل سے غیر مانوس اس ناخواندہ خاندان کی جوہر ٹاؤن کے خوشحال طبقے میں حیثیت اچھوتوں کی سی تھی۔ زہرہ کا مکینک باپ شہزاد بٹ اپنا زیادہ وقت نئے گھر کی چھت پر ہوائی فائرنگ کر کے گزارتا تھا۔ اس خاندان کی زندگی میں نیا ڈرامائی موڑ 30 اپریل 2012 کو آیا جب رقم کے تنازع پر شہزاد بٹ نے اپنی بیٹی زہرہ اور بیوی نبیلہ بی بی کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اس قتل کی وجہ زہرہ کا دوسری شادی کرنے کا منصوبہ تھا۔ ان متاثرہ خاندانوں کے سابق وکیل اسد منظور بٹ نے اس پر تبصرہ کیا کہ یہ لوگ مالی حیثیت اور ذات کے لحاظ سے کم حیثیت رکھتے تھے۔ انہیں کوئی اندازہ نہیں تھا کہ

Scanned with CamScanner

پیسے کیسے خرچ کئے جائیں۔

اس حادثے نے میری زندگی پر بھی کئی اثرات مرتب کیے۔ امریکہ پہنچتے ہی مجھے ڈیپارٹمنٹ آف جسٹس کی تحقیقات کا سامنا کرنا پڑا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے کچھ غلط نہیں کیا لیکن جان کیری نے پاکستان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس معاملے کی آزادانہ تحقیقات کرائے گا۔ چنانچہ میرے پاس کوئی چوائس نہیں تھی۔ بریف کیس کے ساتھ دو افراد میرے سامنے بیٹھے اور مجھے پوری کہانی A سے Z تک سنانے کو کہا۔ میں ایک منٹ میں اس مقام پر پہنچ گیا جہاں 27 جنوری کو پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا۔ یہ میرے لیے ایک دھچکا تھا۔ وہ میری بات سمجھ رہے تھے لیکن تحقیقات اسی طرح کر رہے تھے جیسے پاکستانی پولیس کر رہی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بھی اپنی نوکری ہی کر رہے ہیں۔ کچھ گھنٹوں کی تفتیش کے بعد میں نے ان سے کہا کہ "بس بہت ہو گیا۔ آپ مجھ پر چارج لگائیں اور جائیں۔ میں اب کچھ نہیں بتاؤں گا۔" انہوں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ اپنے پن اور کتابیں بند کیں اور کہا:

"شکریہ مسٹر ڈیوس۔" اور یہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے۔

اس حادثے نے میرے کیریئر پر جو اثرات مرتب کیے، وہ میرے لیے نقصان دہ تھے۔ میں سکیورٹی کلیرنس حاصل نہیں کر سکا اور مجھے کسی بھی اوورسیز سکیورٹی کنٹریکٹ کے لیے ناموزوں قرار دے دیا گیا۔ کتنا مشکل ہے کہ آپ نے جس ملازمت کی ٹریننگ حاصل کی ہو، وہ آپ کو نہ کرنے دی جائے۔ ایک گولی نے میرا سب کچھ ختم کر دیا اور پھر اس کے بعد میں کبھی بھی پرانا آزمودہ سپاہی نہیں بن سکا۔

ایک دن میں نے ربیکا کے سامنے بازو پھیلاتے ہوئے نہایت افسردہ لہجے میں کہا:

"میں اب کیا کر سکتا ہوں؟ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ گن کیسے چلائی جاتی ہے؟"

لیکن اسی لمحے میں نے محسوس کیا کہ میں ایک خوش قسمت آدمی ہوں۔ میرے بہت سے سابق ساتھی بہت خوش قسمت نہیں تھے۔

Scanned with CamScanner

میں نے اپنے پہلے معاہدے کی نوکری سے قبل اپنے بہت سے دوستوں کو تربیت دی۔ان میں سے ایک دوست تربیت کے چھ ماہ بعد ہی عراق میں مارا گیا جب گرین زون میں ایک خودکش حملہ آور نے اپنے آپ کو دھماکے سے اُڑا لیا۔اس کے ساتھ تین اور لوگ بھی مارے گئے۔یہ واقعہ 2004 میں ہوا تھا۔یہ سال عراق کی جنگ کا سب سے خطرناک سال تھا۔میں دراصل اسی سال عراق جانے کے لیے ہی منتخب کیا گیا تھا لیکن آخری لمحے میں مجھے حامد کرزئی کی حفاظت کے لیے افغانستان جانے کو کہہ دیا گیا۔میری زندگی میں فوج کی ملازمت اور پرائیویٹ کنٹریکٹر کی حیثیت سے بہت سے مشکل لمحات آئے لیکن پاکستان میں گزارے گئے یہ 49 دن میری زندگی کے مشکل ترین دن تھے۔لاہور میں ہونے والا واقعہ میری زندگی کا ''ٹرننگ پوائنٹ'' تھا۔میں اپنی زندگی میں لفظ ''حادثے'' کے بہت قریب ہو گیا، کیونکہ یہ لفظ میری زندگی کے ساتھ جڑ گیا تھا۔آپ وکی پیڈیا پر جائیں اور مجھے دیکھیں تو آپ مجھے تلاش نہیں کر سکیں گے لیکن اگر آپ ریمنڈ ڈیوس حادثہ لکھیں تو تلاش کر لیں گے۔میری یہ شناخت 27 جنوری 2011 کے واقعے کی وجہ سے بنی۔

لاہور کے واقعے کے بعد میں نے اور ربیکا نے طلاق پر اتفاق کیا۔یہ علیحدگی ابھی تک میری پریشانی اور اداسی کی وجہ ہے۔میں نے بیرون ملک کام کرتے ہوئے جو کچھ کمایا تھا، وہ اس نے بلوں کی ادائیگی پر خرچ کر دیا۔اس نے ہمارے تعلقات کو بھی خراب کر دیا۔

میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ جنگ کے بارے میں کچھ خوبصورت نہیں۔

گھر میں میں صرف یہ خوبصورتی ہے کہ آپ بچے کو بھاگتے ہوئے دیکھیں۔آپ اُن کے ساتھ کھیلیں اور آپ انہیں مذاق کرتا ہوا دیکھیں۔یہ خوبصورتی ہے۔میں نے بیرون ملک کام کرتے ہوئے جو کچھ کیا، یہ خوبصورتی نہیں ہے۔میں تو صرف اپنی نوکری کر رہا تھا۔

....

Scanned with CamScanner

سچ......پبلشر نوٹ

ریمنڈ ڈیوس کی کتاب آپ نے پڑھی۔ بظاہر تو یہ کتاب پاکستانیوں کے سفاک قاتل کی رہائی کے لیے سیاسی و عسکری قیادت کے باہم تعاون کی شرمناک داستان ہے، لیکن پاکستانی نقطہ نظر سے آپ اس پر سو فیصد یقین نہ کریں لیکن اس کتاب سے حکومتی سطح پر ہونے والے گٹھ جوڑ کے حالات و واقعات کی سمجھ ضرور آتی ہے۔ اس کتاب نے ایک طرف جہاں پاکستانی حکمرانوں کا چہرہ بے نقاب کیا، وہاں اسے رہا کروانے والے چہروں سے نقاب اتار دیا۔ اس کتاب میں کتنا سچ اور کتنا جھوٹ لکھا گیا؟ یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن یہ پاکستان کے نقطہ نظر کے حوالے بڑی اہم ہے کیونکہ پاکستان کے عوام کے سامنے سچ ہی آنا چاہیے۔ عوام یہ جاننے میں حق بجانب ہیں کہ آئی ایس آئی نے اگر ایسا کیا تو لازمی بات ہے کہ اسے یہ ہدایات حکومت کی طرف سے دی گئی ہوں گی۔ یہ تفصیلات سامنے آ چکی ہیں کہ جنرل کیانی اور جنرل پاشا کو یہ سب کچھ کرنے کے احکامات اس وقت کے صدر زرداری نے دیئے تھے اور رہائی کے بعد حکومت نے ذمہ داری لینے کا وعدہ کیا تھا لیکن بعد میں وہ مکر گئے۔ عسکری حلقوں کی طرف سے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا گیا۔

المیہ یہ ہے کہ آج اس واقعہ کو عرصہ گزر جانے کے باوجود بدنامی کا یہ طوق کوئی بھی اپنے گلے میں پہننے کے لیے تیار نہیں۔

فیکٹ پبلی کیشنز کی طرف سے اس کتاب کا ترجمہ دراصل حقائق تک پہنچنے کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

ابو حذیفہ

Scanned with CamScanner

خونی رقم.......

ابو حذیفہ

ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کے لیے مرنے والوں کے لواحقین کو خون بہا کے طور پر دی جانے والی دیت کی رقم پاکستان کی تاریخ کی سب سے زیادہ رقم تھی لیکن 24 کروڑ کی یہ رقم خاندان کے 18 افراد کے لیے خونی بن کر ان کی تباہی اور بربادی کا باعث بن گئی۔ یہ داستان دوسروں کے لیے بھی عبرت کی ایک مثال ہے۔ فیضان حیدر کی اہلیہ زہرا کا خاندان جوہر ٹاؤن کی خوشحال آبادی میں منتقل ہو گیا۔ فیضان کا مکینک باپ شہزاد بٹ اپنا زیادہ وقت نئے گھر کی چھت پر ہوائی فائرنگ کر کے گزارتا تھا۔ اس خاندان کی زندگی میں نیا ڈرامائی اس وقت آیا جب شہزاد بٹ نے دوسری شادی کر لی۔ فیضان کی بہن نے ایک لالچی شخص سے شادی کر لی۔ فیضان کی بیوی اور شیر خوار بیٹے کو کل پانچ کروڑ ملے تھے، زہرہ دوسری شادی کرنا چاہتی تھی لیکن باپ لڑکے کو پسند نہیں کرتا تھا۔ ماں بیٹی کی طرف دار تھی۔ فیضان کے والد کو غصہ آیا اور اس نے اپنی بیوی اور دونوں بیٹیوں کو قتل کر دیا۔ یہ خود اس وقت جیل میں سڑ رہا ہے۔ پیسہ، گھر اور گاڑی دوسری بیوی کے قبضے میں چلی گئی۔ وہ کسی دوسرے آدمی کے چکر میں پڑی اور وہ شخص سارا مال لیکر غائب ہو گیا۔ فیضان کے دوسرے بھائی بھی دولت گنوا کر کوڑی کوڑی کے محتاج ہو گئے۔ اُدھر فہیم کے لواحقین بھی رقم کے لیے لڑتے رہے۔ یہ آدھا خاندان بھی قتل ہو گیا۔ کروڑوں کی رقم میں سے کچھ وکیل کھا گئے، کچھ پولیس کھا گئی اور کچھ رشتہ داروں نے ہڑپ کر لیا۔ یہ خاندان اس وقت کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہے۔ فہیم کی بیوی شمائلہ نے زہریلی گولیاں کھا کر خودکشی کر لی اور بعد میں پیسوں کے لیے اس کا خاندان بھی لڑتا رہا۔ اس خاندان کے کچھ افراد بھی جیل میں ہیں۔ ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کے لیے ملنے والے کروڑوں روپے کے منحوس اثرات ابھی تک ہیں اور پیسے لینے والا کوئی بھی فرد اس کے اثرات سے پیچھا نہیں چھڑا سکا۔ یہ رقم ان کا خون چوستے ہوئے نجانے کس چیز کا حساب مانگ رہی ہے۔

ISBN 978 969 632 010 9
9 789696 320109

فیکٹ پبلیکیشنز
Website: www.factpublications.com
Email: info@factpublications.com

Scanned with CamScanner